

قرآن پاک اور فلسفہ و سائنس میں تعلق

ابن سینا ، سر سید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور چند معاصر علماء اور مکاتب فکر کے نظریات کا تنقیدی جائزہ

خلاصہ: مذہب زندگی اور کائنات کے آغاز ، مقصد اور سٹرکچر کے بارے میں اہم نظریات پیش کرتا ہے جن کی بنیاد وحی و الہام پر ہوتی ہے، جنہیں نبی یا رسول کی صداقت اور امانت پر ایمان بالغیب کی بنیاد پر مانا جاتا ہے۔ فلسفہ اور سائنس اپنا تصور کائنات منطقی استدلال اور تجربی تصدیقات کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں، چنانچہ کسی زمانے کے فلسفہ و سائنس کے اہم نظریات اور تصور کائنات کو اس زمانے کے 'صداقت کے عقلی معیار' (rational version of truth) کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مذہب کو ماننے والے ، اپنے مذہب کی تعلیمات کو 'صداقت کا الہامی معیار' (revealed version of truth) سمجھتے ہیں۔ انکی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے مذہبی عقائد کی عقلی تائید کر کے انہیں اپنے زمانے کے معیار عقل کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کر یں تا کہ راسخ الاعتقادی اور اذعانیت کے اعتراض سے بچ سکیں۔ فلسفہ و سائنس کے نظریات بہر حال حتمی نہیں ہوتے اور مزید تحقیق کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات اور بطلیموس کا نو سماوی کروں پر مشتمل تصور کائنات ابن سینا کے زمانے کا معیار عقل تھے۔ سر سید احمد خان کے زمانے میں نیوٹن کا سائنسی نظریہ کائنات اور اسکی معیت میں پیدا ہونے والا نیچرل ازم معیار عقل کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال کے زمانے میں آئن سٹائن کا سائنسی نظریہ کائنات اور برگساں اور جیمز وارڈ وغیرہ کے فلسفیانہ مکاتب فکر معیار عقل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے مذہبی عقائد اور اپنے زمانے کے معیار عقل میں تطبیق قائم کرنے کے اصول وضع کئے اور انہیں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ موجودہ دور میں یہی کام 'انٹر نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک تھٹ'، سید حسین نصر (روایت کا مکتب فکر) ، ضیاء الدین سردار (اجمالی مکتب فکر) اور مورس بکائل کے مکاتب فکر کر رہے ہیں۔ بعض انفرادی مذہبی سکالر ز نے بھی اپنے طور پر اس سلسلے میں کوششیں کی ہیں۔ درج ذیل کاوش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ پیشرو مفکرین کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے فہم قرآن کے مطابق کسی بھی زمانے کے معیار عقل کے ساتھ مذہبی عقائد کو مربوط کرنے کے اصول وضع کر کے اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ مسلمانوں میں قرآنی تناظر میں فلسفہ و سائنس کے مطالعہ اور تحقیق کی بصیرت پیدا ہو۔

اہم اصطلاحات: قرآن، سائنس ، فلسفہ ، قرآنی اصول، نظریہ ارتقاء، بدعت، تھیوری ، مسلمہ سائنسی حقائق

فلو آف الیگز نڈریا (Judaeus Philo c.20 BCE-40 CE) جسے فلو جوڈیس بھی کہا جاتا ہے ، ایک یہودی مذہبی سکالر تھا جو افلاطون (وفات 384 ق م) کے فلسفے سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ یہودیت کو صداقت کا الہامی اور افلاطونی فلسفے کو صداقت کا عقلی ورژن سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ صداقت کا صداقت سے تناقض ممکن نہیں۔ (Truth cannot contradict truth.) عقائد مذہب کی فلسفیانہ اصطلاحات میں تعبیر ، انہیں منطقی اصولوں اور فلسفیانہ نظریات سے ہم آہنگ ثابت کرنا اس کے نزدیک بڑا قابل قدر علمی کام تھا۔ اس کے زمانے میں ابھی کسبی علوم کی فلسفہ اور سائنس میں تقسیم وجود میں نہیں آئی تھی۔ صرف فلسفہ ہی تمام علوم کا مخزن سمجھا جاتا تھا۔ یہودیت کی فلسفہ ء افلاطون سے تطبیق کی بنیاد پر فلو تاریخ فلسفہ میں مذہب کی عقلی تشکیل (reconstruction of religious thought) کے رجحان کا بانی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے فروغ کے زمانے میں عیسائی علماء اور اسلام کے فروغ کے بعد مسلمان علماء بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ کاوش آج تک چلی آ رہی ہے۔

ٹالمی (بطلیموس-Ptolemy، 100-168ء) کا فلکیاتی ماڈل ابن سینا (980-1037ء) کے زمانے کی سائنس تھی۔ بطلیموسی تصور کائنات ارض مرکزی تھا۔ زمین کائنات کے مرکز میں واقع اور ساکن تھی۔ ارض مرکزی کائنات نو افلاک پر مشتمل تھی اور سورج ، چاند اور معلوم سیاروں کو مختلف افلاک پر ظاہر کیا گیا تھا۔ پیشرو ماہرین فلکیات کی تحقیقات اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات کے زیر اثر یہ کائناتی ماڈل پیش کیا گیا جو تقریباً 1400 سال تک سائنسی نظریہ ء کائنات کی حیثیت سے رائج رہا۔ یقیناً اس کے کچھ عملی فوائد تھے تبھی یہ اتنا عرصہ قائم رہ سکا۔ مثلاً زرعی مقاصد اور تاریخی واقعات کا ریکارڈ

رکھنے کیلئے کیلنڈر وضع کرنا ممکن ہو سکا۔ بابل کے لوگ سیاروں کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ علم النجوم اور سُرّی علوم کی مختلف صورتیں وجود میں آئیں۔ اس ماڈل کی بنیاد پر چاند اور سورج گرہن اور موسموں کے بارے میں پیشین گوئیاں بھی ممکن تھیں۔



Aristotle's Universe

Geocentric universe of Aristotle and Ptolemy¹

ابن سینا قرآن کو صداقت کا 'الہامی' اور فلسفہ ارسطو اور بطليموس کے سائنسی فلکیاتی ماڈل کو صداقت کا 'عقلی ورشن' سمجھتا تھا۔ فلو اور عیسائی علماء کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اسلام اور فلسفہ و سائنس میں مطابقت ثابت کر کے اسلام کو عقلی مذہب ثابت کر سکے۔ لیکن ہفت افلاک پر مشتمل قرآنی تصور کائنات اور نو افلاک پر مشتمل بطليموسی سائنسی تصور کائنات میں تطبیق کیونکر ممکن تھی! ابن سینا کو قرآنی فلکیات کو چھوڑ کر بطليموسی فلکیات کا اثبات کرنا پڑا۔ ارسطو اپنے فلسفہ میں خدا اور مادہ دونوں کو قدیم (eternal) ٹھہراتا ہے۔ کائنات کی ہر شے ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ اس طرح مادہ خدا کا ہمسر بھی ٹھہرتا ہے اور شریک بھی۔ جبکہ اسلام کا خدا واحد ہے۔ نہ کوئی اسکا ہمسر ہے اور نہ شریک۔ وہ احد یعنی تمام تعینات سے پاک ہے اور تمام تعینات کا ابداء کرنے والا ہے۔ جو کچھ بھی کائنات میں ہے وہ یا تو اس کی خلق کی کبیٹیگری سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے امر کی کبیٹیگری سے، یا دونوں اس طرح یکجا ہیں کہ خلق، اللہ کے امر سے متحرک ہے۔ اب قرآن کے خدا کی ارسطو کے خدا سے تطبیق کیونکر ممکن تھی! ارسطو کا نظریہ ہے کہ اپنے اندر کسی کمی کو پورا کرنے یا اپنے اندر کسی نقص کو دور کرنے کی تدبیر کی صلاحیت کا نام ارادہ ہے۔ ارسطو استدلال کرتا ہے کہ دونوں صورتوں میں صفت ارادہ اپنے موصوف کے نقص (imperfection) پر دلالت کرتی ہے۔ خدا کا تصور ایک کمال مطلق کی حامل ہستی (Absolutely Perfect Being) کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ لہذا صاحب ارادہ ہونا خدا کی شان کے منافی ہے۔ قرآنی پاک صفت ارادہ کو خدا کی شان قرار دیتا ہے۔ قرآنی خدا کی صفت ارادہ کو کسی اور صفت میں تحویل کئے بغیر ان دو متناقض تصورات خدا میں مطابقت قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسلام کی عقلی تشکیل کیلئے ابن سینا کو یہی کچھ کرنا پڑا۔ ابن سینا نے خدا کی صفت ارادہ کو اسکی صفت علم کے مترادف ٹھہرایا۔ صفت علم کا یہ تصور بھی قرآنی تصور نہیں تھا۔ تخلیق کائنات ارادے اور اسکی مطابقت میں امر کی متقاضی ہے۔ جو خدا صاحب

ارادہ اور صاحب امر نہ ہو وہ کائنات کا خالق کیونکر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا کو قرآنی نظریہ ء تخلیق کی عقلی تعبیر کر کے اسے یونانی فلسفی فلاطینوس کے نظریہ سے مماثل نظریہ صدور میں تحویل کرنا پڑا۔ وجود باری پر استدلال کرتے ہوئے ابن سینا خدا کا تصور علت العال (uncaused first cause / prime cause) کی حیثیت سے کرتا ہے۔ کیا اس تصور خدا کو صاحب ارادہ اور صاحب امر خدا کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ممکن ہے! فلسفی کسی مذہب کا پیروکار ہو تو بھی فلسفہ آرائی کرتے ہوئے وہ ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکل غیر جانبدار عقلی استدلال کی بناء پر ہی مانتا ہے۔ خدا کو علت العال متصور کر کے ابن سینا علت اور معلول میں منطقی لزوم کے تعلق کو ماننے پر مجبور ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا آزاد رہا نہ انسان؛ خدا کا علم جزئیات سے انکار لازم ٹھہرا۔ دعا، معجزات، الوہی استعانت، حشر اجساد پر چیز ہے معنی ہو گئی۔ فلسفہ و سائنس کو صداقت کا ’عقلی معیار‘ مانتے ہوئے وہ ان کا اثبات کر بھی کیسے سکتا تھا۔ ابن سینا، بطلموس کی نو افلاک پر مشتمل فلکیات میں کسی بنیادی تضاد کی نشاندہی کر کے اسے مسترد کرنے، ہفت افلاک پر مشتمل کوئی نیا نظریہ ء کائنات وضع کرنے، ارسطو کے فلسفیانہ تصورات کی ایسی تعبیر جو اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہو، یا عقلی علوم کو قرآنی عقائد سے ریلیٹ کرنے کے بنیادی اصول وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ (ابن سینا کے نظریات کے تفصیلی مطالعہ کیلئے دیکھئے ہمارا مضمون: ’تخلیق، صدور اور ہم ازلیت‘)

نظریات، اصطلاحات پر استوار ہوتے ہیں اور انہیں پر سوار ہو کر تاریخ میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اگر نظریات کی تشکیل یا تعبیر کیلئے غیر موزوں اصطلاحات کا انتخاب کر لیا جائے تو وہ ان نظریات کے علاوہ دیگر نظریات کے صحیح فہم میں بھی رکاوٹ بنتے ہیں، اور بعض اوقات اس غلطی کے سبب کا ادراک ہونے اور اس کا تدارک کر سکنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ ارسطو کے تقریباً چودہ سو سال بعد امام غزالی صاحب (1058-1111ء) نے ارسطو کے ’ارادے‘ کی تعریف میں پائی جانے والے نقص کا ادراک کر کے ’ارادے‘ کی وہ تعریف پیش کی جس کے مطابق صاحب ارادہ ہونا ایک شان قرار پاتا ہے اور خدا کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ امام غزالی صاحب نے ابن سینا کے فلسفے میں پائے جانے والے دیگر نقائص کی بھی نشاندہی کی جو ارسطو کی ما بعد الطبیعات، منطق اور علیت کے تصورات کو قبول کر لینے سے اس کے نظریات میں در آئیں تھیں (تخلیق، صدور اور ہم ازلیت)۔

نیوٹن کا نظریہ ء کائنات اور نیچرل ازم

گیلیلیو، کوپرنیکس، اورجوانس کپلر کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے آئزیک نیوٹن (1643-1727) نے 1687ء میں ایک لامحدود، ازلی، مشین نما، سہ ابعادی مادی کائنات کا عظیم الشان نظریہ پیش کیا جس میں مقدار مادہ اور مقدار قوت ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ مادہ اور قوت صرف شکلیں بدلتے ہیں لیکن کبھی مطلق طور پر فنا نہیں ہوتے۔ کائنات میں کوئی چیز داخل ہوتی ہے نہ خارج ہوتی ہے۔ قوانین فطرت بھی قدیم ہیں۔ کائنات ازل سے قوانین فطرت کے مطابق چلتی چلی آ رہی ہے۔ کائنات میں ما فوق الفطرت واقعہ (supernatural event) ممکن نہیں۔ کائنات آٹو میٹک مشین کی مانند اپنے قوانین فطرت کے مطابق از خود چلتی چلی آ رہی ہے، اور چلتی چلی جائے گی۔ حرکت از خود نہیں ہو سکتی۔ مشین کو چلانے کیلئے سب سے پہلی حرکت کہاں سے آئی، صرف اس سوال کے جواب کیلئے نیوٹن خدا کو ماننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق خدا وہ ہستی ہے جس نے کائنات کو پہلی بار حرکت دی۔ اس کے بعد خدا کا کائنات میں کوئی رول نہیں۔ کائنات کے پارٹ آپس میں اس طرح متعلق ہیں کہ ایک پارٹ میں کوئی تبدیلی دیگر اجزا میں ان کے فنکشن کے مطابق خود بخود منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ سہ ابعادی مادی کائنات میں تمام چیزیں اقلیدسی جیومیٹری کے مطابق ہیں۔ نیوٹن کے نظریے کو ما قبل نظریات پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ اگر کسی مظہر کے بارے میں قانون فطرت معلوم کر لیا جائے تو ترقی یافتہ ریاضیاتی نظام اور تجربی تصدیق کے ذریعے دنیا کے کسی بھی حصے میں اس کی توثیق کی جا سکتی تھی۔ زمان (Time) سہ ابعادی مادی کائنات کے یکساں طور پر متوازی، ایک یک بُعدی، حقیقت کے طور پر ہمیشہ سے اس طرح موجود ہے کہ کسی لمحے زمین پر ہونے والا ایک واقعہ اور کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر ہونے والا واقعہ ہموقت (simultaneous) ہوتے ہیں۔ اس کائناتی ماڈل میں تمام مقادیریں، فاصلے اور وقت مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ نیوٹن کے کائناتی

ماڈل میں ، اسلام کے ہفت افلاک کے تصور کے مقابل، افلاک کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ii قرآن پاک جس خدا کے اسماء الحسنیٰ بیان کرتا ہے، نیوٹن کے نظریہ کائنات میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اس کائناتی ماڈل میں عبادت، دعا، التجا، مناجات، معجزات اور الوہی ایڈمنسٹریشن کی کوئی گنجائش نہیں۔ مادے، حیات، ذہن ، روح، آزادیء ارادہ وغیرہ کی تشریح کیلئے قوانین فطرت ہی کا فی اور واحد ذریعہ ہیں۔ وحی و الہام ، روحانی تجربات سب خالصتاً فطری واقعات ہیں۔ کچھ بھی ما فوق الفطرت نہیں۔ وحی و الہام کے مافیہ کو صرف اسی حد تک مانا جا سکتا ہے جس حد تک ان کی تشریح قوانین فطرت کے مطابق خالص عقلی انداز میں کی جا سکتی ہو۔ مذہب کا جواز یہی ہے کہ اسے رائج الوقت فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر ماننا ممکن ہو۔ نیوٹن کا مکینیکل ورلڈ ویو ایک میکانیکی کائنات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ اسلام ایک الوہی طور پر ایڈمنسٹرڈ کائنات (divinely administered universe) کا تصور پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ نیوٹن کے نیچرل ازم کی بنیاد پر نہ تو شخصی خدا کو مانا جا سکتا ہے جس نے کائنات کو اپنے ارادے سے تخلیق کیا ہو، جو اپنے علم اور قدرت میں کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہو، اور نہ ہی ایسی کائنات کو مانا جا سکتا ہے جو حادث ہو اور اللہ کے علم اور امر سے ایڈمنسٹر کی جا رہی ہو۔ نہ ہی فرشتوں کو ما فوق الفطرت ہستیوں کی حیثیت سے اور وحی و الہام کو ما فوق الفطرت ذریعہ علم کی حیثیت سے ، اور نہ ہی جنت ، دوزخ، حیات بعد الممات اور جزا کے تصورات کو ما فوق الفطرت حقائق کی حیثیت سے ماننا ممکن ہے (Evolving a Qur'anic Paradigm, 275-79)۔

سر سید احمد خان کا جدید علم الکلام

(Work of God overrides the Word of God)

سر سید احمد خان (1817-1898ء) کے زمانے میں نیوٹن کی سائنس کے وارث ہندوستان فتح کر چکے تھے۔ حاکم کو محکوموں پر ویسے ہی ایک فوقیت حاصل ہوتی ہے، اگر وہ محض جنگی قوت ہی میں فائق نہ ہو بلکہ فی زمانہ برتر علمی قوت سے بھی لیس ہو تو محکوموں کیلئے اپنے عقائد کا دفاع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی اسی صورتحال سے دو چار تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے سکالر اور پادری بھی آئے جو مسلمانوں کے دعا، معجزات، کائنات کی خدائی ایڈمنسٹریشن، رسم و رواج ، تاریخی واقعات، مذہبی روایات اور دیگر بہت سے عقائد کو عقلی حوالوں سے چیلنج کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے کچل ڈالنے کی پالیسی پر بھی عمل پیرا تھے۔ انہوں نے فارسی زبان کی جگہ، جو صدیوں سے مسلمانوں کی علمی، سرکاری درباری اور ثقافتی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی، انگریزی زبان کو رائج کر کے مسلمانوں کو ان کے علمی اور ثقافتی ورثے سے محروم اور سرکاری ملازمتوں کیلئے نا اہل کر دیا۔ اس صورتحال میں سر سید احمد خان مسلمانوں کی مدد اور رہنمائی کیلئے آگے بڑھے۔ اسوقت ہم اس چیلنج پر توجہ مرکوز کریں گے جو برٹش انڈیا میں علمی اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کو درپیش تھا اور سر سید احمد خان نے اس کا جو حل پیش کیا اس کی قدرو قیمت کا جائزہ لیں گے۔

نیوٹن کا میکانیکی نظریہ کائنات سر سید احمد خان کے زمانے کی سائنس اور اس کے ساتھ ابھرنے والا نیچرل ازم ان کے زمانے کا فلسفہ تھا۔ یہ دونوں بہت سے بنیادی نکات پر اسلام سے متناقض تھے۔ سر سید احمد خان جدید فلسفہ و سائنس ، برطانوی قوم کے معاشرتی ، سیاسی اور ثقافتی انضباط ، ان کے تعلیمی اداروں اور عقلی علوم سے بہت متاثر تھے۔ قرآن پاک کی عقلی تعبیر کر کے جدید فلسفہ و سائنس سے ہم آہنگ ثابت کرنا انہوں نے مسلمانوں کو ذہنی ہزیمت سے نکالنے کیلئے ضروری سمجھا۔ انیسویں صدی کے برٹش انڈیا میں مسلمانوں کو درپیش علمی چیلنج کی نوعیت یہ تھی کہ (۱) ثابت کیا جائے کہ نیچرل ازم غلط نظریہ ہے یا یہ مشکوک مفروضات پر مشتمل ہے؛ یا (۲) مسلمان ایسا نہ کر سکیں تو پھر طے کر لیں کہ ہمیں آنکھیں بند کر کے اپنے عقائد پر قائم رہنا ہے؛ یا (۳) فلو، عیسائیوں، اور ابن سینا کی طرح اپنے عقائد کی عقلی تعبیر کر کے انہیں اپنے زمانے کے معیار عقل (فلسفہ و سائنس) ، ان کے بنیادی مفروضوں ، نتائج اور مضمرات کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کیا جائے۔ سر سید احمد خان نے اس

آخری کام کا بیڑہ اٹھایا اور پندرہ نکات پر مشتمل ایک فریم ورک پیش کیا جسے انہوں نے 'جدید علم الکلام' (Theology of modernity) کا نام دیا۔

ابن سینا کی طرح سر سید احمد خان بھی خدا کا اثبات کونیاتی استدلال کے ذریعے علت العلل (Uncaused First Cause) کی صورت میں کرتے ہیں، اس علت العلل کو وحدت الوجودی انداز میں متصور کرتے ہیں، اور صفات باری کی تعبیر معتزلہ کے انداز میں، الٰہی فعلیت کے طور پر، کرتے ہیں۔ اس نظریہ کو سر سید احمد خان کے 'ریشنل سپر نیچرل ازم' کا نام دیا جاتا ہے۔ (Muhammad Khalid Masud 2007) علت العلل کے صاحبِ شعور، صاحبِ ارادہ، خالق کائنات ہونے کا جواز کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ علت العلل کس طرح "دو دن میں زمین کو تخلیق کرنے، کل چار دن میں زمین سمیت اس پر رکھے گئے وسائل تخلیق کرنے، دو دن میں سات آسمان تخلیق کرنے" کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ (القرآن، 12: 41-9) اس عقیدے کی بنیاد پر وحی والہام، نبوت و رسالت، روحانیت، ہفت افلاک، حیات بعد الممات، حشر، اخلاقی آزادی اور ذمہ داری وغیرہ عقائد کا اثبات کیونکر ممکن ہے، ان کاکچھ ذکر ہم شیخ الرئيس ابن سینا کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ قرآن پاک خدا کو احتیاج سے پاک، اور اپنے علم، ارادے اور امر سے کائنات کو تخلیق کرنے والا ٹھہراتا ہے۔ فطرت، قوانین فطرت، قانون علیت اس کے مقرر کردہ اور اس کی قدرت کے تابع ہیں نا کہ وہ خود علت ہے، یا قانون علیت کے تابع ہے۔ قرآن پاک اپنے کو 'الحق' یعنی معیار حق قرار دیتا ہے۔ جو نظریہ، تصور، تعقل اس سے ہم آہنگ ہے وہ حق ہے، جو اس سے متناقض ہے، باطل ہے، جو اس کے خلاف ہے 'بغیر الحق' ہے، اس سے انحراف 'الضلال' ہے، اس کی سند کے بغیر بات کرنا 'ظن' (conjecture) ہے اور ظن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ اللہ کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا جس کی تصدیق قرآن پاک سے نہ ہوتی ہو، 'افتراء' (concoction) ہے۔

قرآنی تعلیمات کو نیوٹن کی میکانیکی سائنس اور اس سے اخذ ہونے والے نیچرل ازم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کیلئے سر سید احمد خان نیچر کیلئے صنعت الٰہی (Work of God) اور قرآن پاک کے لئے 'کلام الٰہی' (Word of God) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ دونوں کا منبع ایک ہی ذات باری ہے اس لئے ان میں تناقض ممکن نہیں۔ اپنے 'جدید علم الکلام' کا اہم ترین اصول پیش کرتے ہوئے سر سید استدلال کرتے ہیں کہ 'سائنس و فلسفہ' اور 'کلام الٰہی' میں تناقض کی صورت میں کلام الٰہی کو استعاراتی تعبیر کے ذریعے کائنات کی سائنسی تعبیر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے گا (Iqbal's 2007 Approach to Islamic Theology of Modernity)۔ یہ اصول، قرآن پاک، جو اسلام میں معیار حق کا درجہ رکھتا ہے، کی تعبیر کو نیچر کی سائنٹفک سٹڈی کے تابع کر دیتا ہے۔ سر سید احمد خان کے نزدیک نیوٹن کا نظریہ کائنات، ہی کائنات کی سائنٹفک سٹڈی کا معیار تھا۔ سر سید احمد خان ۱۸۹۸ء میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور آئن سٹائن کا سپیشل نظریہ اضافیت ۱۹۰۵ء میں اور جنرل نظریہ اضافیت ۱۹۱۵ء میں نیوٹن کے میکانیکی نظریہ کائنات اور اس کی معیت میں پیدا ہونے والے نیچرل ازم کی جگہ لے لیتے ہیں جس کے ساتھ قرآن پاک کو عقلی تشکیل کے ذریعے ہم آہنگ کرنے میں سر سید احمد خان نے زندگی کی بہترین صلاحیتیں اور وقت صرف کر دیا تھا۔ (Evolving a Qur'anic Paradigm, 278-80)

آئن سٹائن کا نظریہ ء کائنات اور نیچرل ازم

نیوٹن کے نیچرل ازم میں مکان اور زمان میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ فزیکل سپیس ایک فلیٹ، سہ ابعادی، لامحدود مادی مسلسلہ (three dimensional continuum) اور زمان، یک بُعدی مسلسلہ کے طور پر ازل سے سپیس کے متوازی حقیقت کے طور پر موجود تھا۔ نیوٹن کی کائنات، ایک لا محدود سپیس تھی جو ایک لا محدود نیوفارم ٹائم کے متوازی موجود تھی۔ آئن سٹائن نے نیوٹن کے بر عکس اپنے نظریہ ء اضافیت میں تجویز کیا کہ ٹائم، الگ حقیقت نہیں بلکہ سپیس ہی کی ایک ڈائمنشن ہے۔ آئن سٹائن کا نیچرل ازم سپیس کو چار ابعادی حقیقت کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس میں ٹائم مطلق نہیں، تجربہ کنندہ کے اعتبار سے اضافی ہے۔ آئن سٹائن کی مکانی-زمانی کائنات کی بنیادی اکائیاں واقعات (events) ہیں جبکہ نیوٹن کی میکانیکی کائنات میں بنیادی اکائیاں چیزیں (things) تھیں۔ آئن سٹائن نے یہ بھی تجویز

کیا کہ مکان-زمان فلیٹ نہیں بلکہ کروی ہے۔ اُن سٹائن یہ بھی کہتا ہے کہ بہت بڑے ماس والی چیزیں ٹائم کو تیز یا مدہم کر سکتی ہیں۔ کائنات کل کتنے ابعاد پر مشتمل ہے، حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ چند ہم عصر نظریات تجویز کرتے ہیں کہ کائنات کے ابعاد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں جتنے اُن سٹائن نے تجویز کئے تھے۔ نیوٹن کی طرح، اُن سٹائن بھی شخصی خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا، نہ ہی کائناتی معاملات میں کسی ماورائے فطرت ہستی کے عمل دخل کو مانتا تھا (Space-time in Encyclopaedia Britannica) iii

اقبال کا جدید علم الکلام: مذہبی علم کی سائنسی تشکیل

اُن سٹائن کا نیچر اور کائنات کے سٹرکچر کے بارے میں نظریہ، جیسے کہ ہم دیکھ آئے ہیں، نیوٹن کے نظریہ سے یکسر مختلف تھا۔ ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ نیوٹن کے نزدیک کائنات ازلی جبکہ اُن سٹائن کے نزدیک حادث تھی۔ سر سید کے محولہ بالا اصول کو ماننے کی صورت میں قرآن پاک کی ان آیات کو جو کائنات کو حادث قرار دیتی تھیں، نیوٹن کے ازلی کائنات کے سائنسی نظریہ سے ہم آہنگ کرنے کیلئے استعاراتی تعبیر کر کے کائنات کو ازلی ثابت کرنا ضروری تھا۔ نیوٹن کے نزدیک کائنات کلوزڈ جبکہ اُن سٹائن کے نزدیک مسلسل پھیلتی ہوئی تھی۔ قرآن پاک بھی کلوزڈ کائنات کا تصور نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ آیات جو کلوزڈ یونیورس کے خلاف جاتی تھیں، ان کو بھی استعاراتی تعبیر کے ذریعے کلوزڈ یونیورس کے تصور سے آہنگ کرنا ضروری تھا۔ نیوٹن اور اُن سٹائن، دونوں کے نظریہ کائنات میں آسمانوں کا کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ وہ آیات جن میں سات آسمانوں کا تصور ہے، انکی استعاراتی تعبیر کر کے انہیں ان کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے گا۔ یہ صرف تین مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں قارئین خود سوچ سکتے ہیں۔

نظریہ اضافیت کے بعد سر سید احمد خان کی قرآن پاک، فلسفہ اور سائنس کو مربوط کرنے کی کاوش فرسودہ اور غیر متعلق ٹھہری۔ اب ایک نئے سکالر کی ضرورت تھی جو کلام الہی کی نئی تعبیر کر کے ثابت کرے کہ یہ اُن سٹائن کے سائنسی نظریہ کائنات، نئے نیچرل ازم، دیگر فلسفیانہ اور عقلی علوم کے ساتھ آہنگ ہے یا انہیں ریلیٹ کرنے کے نئے اصول پیش کرے۔ یہاں اقبال، اپنے خطبات کی صورت سامنے آتے ہیں جو 1932ء میں بعنوان “Reconstruction of religious thought in Islam” شائع ہوئے۔ ان خطبات میں اقبال، قرآن پاک کی نئی تعبیر کے ذریعے جدید عقلی علوم کی طرز پر ”مذہبی علم کی سائنسی تشکیل“ (scientific form of religious knowledge) کا تصور پیش کرتے ہیں۔ جناب باسط بلال کوشل اپنے مضمون “Muhammad Iqbal's reconstruction of the philosophical arguments for the existence of God” میں مذہب اور سائنس میں تعلق پر علامہ اقبال کے نظریات کو بڑے موزوں الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

1۔ ”اگر مذہب ایسے طالبین علم کو متوجہ کرنے کا خواہشمند ہے جو ایمان کے لئے، روایت، ثقافت اور عقیدہ، کی بجائے ذاتی تجربہ کو اہمیت دیتے ہیں، تو اسے اپنے آپ کو سائنسی تشریح کیلئے پیش کرنا ہو گا۔

2۔ اگر سائنس، تجربے اور مشاہدے پر مبنی حقیقت کا ایک کلیتی بیانیہ (coherent and holistic account) پیش کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے آپ کو مذہبی تشریح کیلئے پیش کرنا ہو گا۔“

اقبال سمجھتے ہیں کہ ایمان کی بنیاد ایک خاص قسم کے داخلی تجربہ پر ہوتی ہے۔ تصوف، نفسیاتی اور روحانی مشقیں وضع کر کے صدیوں مذہبی افراد کیلئے اس داخلی تجربہ کے ارتقاء کیلئے سہولت فراہم کرتا رہا ہے۔ جدید علوم اور سائنسی تجربے کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکنے کی بناء پر اب تصوف اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس سے اقبال کے جدید علم الکلام کا دوسرا نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ ”جدید کلچر کی یونیک خصوصیات کے پیش نظر اس داخلی تجربے کو ممکن بنانے کیلئے جس پر ایمان کی بنیاد ہوتی ہے، مذہبی فکر کی سائنسی تشکیل (scientific form of religious knowledge) (knowledge) بس ضروری ہے۔“ ڈاکٹر باسط بلال کوشل کے خیال میں ”سائنسی فکر کی قرآنی تناظر میں تشریح اور مذہبی فکر کی جدید سائنسی تناظر میں تشریح کے ذریعے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے ہم مذہبی فکر کا وہ سائنسی ورژن تشکیل دے سکتے ہیں، جسے اقبال اس داخلی تجربے کے لئے لازم سمجھتے ہیں جس پر ایمان کی بنیاد ہوتی ہے۔“ (Koshal, 127)

درج بالا نظریہ کے مثبت یا منفی حاصلات و مضمرات پر کوئی بحث ہے سود ہوگی تا وقتیکہ اقبال کے بنیادی تصور کے درست یا نادرست ہونے کا جائزہ نہ لے لیا جائے۔

ہمارا احساس یہ ہے کہ اگر نیچر کا خدا کے ساتھ ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کیریکٹر کا انسان سے ہوتا ہے، اگر یہ الوہی ذات کے ساتھ اسی طرح متعلق ہے جیسے اعضاء کسی وجود سے متعلق ہوتے ہیں، اگر نیچر کو اللہ کی عادت کے طور پر متصور کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ اقبال کہتے ہیں، پھر لازم ہے کہ نیچر بھی ازلی اور غیر تخلیق شدہ ہو۔ اور یہ بات قرآنی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا نہیں ہے کہ ”کوئی شے اسکی مثل نہیں۔“ (42:11) لہذا وہ کسی کے مماثل ہونے سے یکسر پاک اور انسانی خیال، وبم، تصور، تخیل، تعقل سے ما وراء ہے۔ پھر حیات باری کو کیونکر انسانی حیات پر قیاس کیا جا سکتا ہے! قرآن پاک فرماتا ہے: ”وہی ہے جس نے تخلیق کیا ہے زمین و آسمان کو اور جو کچھ انکے ما بین ہے۔“ (القرآن، 30:8) کیا مادہ اور نیچر، حیات اور کردار، ذہن اور شعور، سماج اور سیاست غرض انسانی تجربہ کے تمام ڈومین جنہیں فزیکل، بائیولوجیکل اور سائنیکولوجیکل، سوشل سائنسز اور دیگر علوم سٹڈی کرتے ہیں، اللہ کے تخلیق کردہ نہیں! پھر کیسے اسی کی تخلیق کردہ نیچر کو اس کے ساتھ آرگینک قرار دیا جا سکتا ہے!

قرآنی تناظر میں نیچر کو سٹڈی کرنے کا جینن طریقہ — امام غزالی سے ایک مثال

الفارابی اور ابن سینا، ارسطو کے زیر اثر، خدا کو علت العلل متصور کرتے ہیں، اور اسکی صفت ارادہ کو اسکی صفت علم میں تحویل کر دیتے ہیں۔ اب انہیں ایک ایسے نظریہ کی ضرورت تھی جس میں وہ کائنات کو ارادہ الہی کے بغیر خدا سے منصفہ شہود پر آتا ہوا دکھا سکیں۔ یہاں فلاطینوس کا نظریہء صدور (theory of emanation) جس میں کائنات ذات باری کی شان اکملیت سے اس کے ارادہ اور امر کے بغیر صادر ہوتی ہے، ان کی مدد کیلئے آگے آتا ہے اور ابن سینا اس میں کچھ تبدیلی کر کے براہ راست صدور کی بجائے درجہ بدرجہ صدور کا نظریہ پیش کرتا ہے جس میں کائنات خدا کے شعور ذات سے دسویں مرحلے پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا فلاسفر بھی ہے اور فزیشن ہونے کے ناطے سائنسدان بھی ہے۔ جبکہ امام غزالی متکلم ہیں، فلاسفر ہیں اور شاہدین میں سے ہیں۔ نظریہ علت، ابن سینا کے فلسفہ کے دو بنیادی تصورات میں سے ایک ہے۔ ابن سینا کے تصور خدا کی لازمی صفت اس کا ’علم‘ ہے نہ کہ ’ارادہ‘۔ لہذا یہ قطعاً تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا علم کسی بھی مقام پر منطق کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ منطق میں نتیجہ اپنے مقدمات سے منطقی لزوم کے ساتھ اخذ ہوتا ہے۔ ابن سینا کے خدا سے جو بھی صادر ہو گا وہ منطقی لزوم کے ساتھ ہو گا۔ ابن سینا کا نظریہ علت، علت اور معلول میں منطقی لزوم کے تعلق پر استوار ہے۔ ایسی کائنات جس میں تمام معاملات بشمول نفسیاتی اور اخلاقی معاملات، منطقی لزوم سے وجود پذیر ہوتے ہوں، وہاں جبریت کا دور دورہ ہو گا۔ خدا بھی آزاد نہیں رہے گا۔ انسان کو اخلاقی آزادی سے محروم کرنے کا نتیجہ اخلاقی جبریت کی صورت میں نکلتا ہے۔ جوابدہی اور جزا کے تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں، دعا و استعانت کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں رہتی، خدا کی قدرت مطلق بھی علت معلول کی منطقی جبریت کے تابع ہو جاتی ہے۔ خدا، کائنات سے صرف منطقی طور پر متقدم اور کائنات خدا سے صرف منطقی طور پر متاخر ٹھہرتی ہے، زمانی اعتبار سے دونوں ہم ازلی (co-eternal) ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کائنات کے قرآنی تصور کہ، یہ نہ ہونے سے ہونا ہوئی ہے، کی نفی ہو جاتی ہے۔ قانون علیت ایک ایسی کلی جبریت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو خدا اور انسان سمیت ہر شے کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ ارسطو کی مابعد الطبیعات جس کا الشیخ الرئیس ابن سینا اتباع کرتے ہیں، کے مطابق ہر چیز مادہ اور صورت کے دو اصولوں سے مرکب ہے۔ ہر شے میں ہیئت (essence) اور وجود (existence) کی دوئی پائی جاتی ہے۔ صرف خدا کی ذات ہی مطلق طور پر سادہ ہے، جس میں نہ مادہ اور صورت کی دوئی پائی جاتی ہے اور نہ ذات اور صفات کی کثرت۔ اسے خدا کی ’مطلق سادہ نوعیت‘ کہا جاتا ہے۔ ابن سینا توحید باری کے قرآنی اصول کی فلسفیانہ تعبیر ’خدا کی مطلق سادہ نوعیت‘ (Absolute Simplicity of God) کی صورت میں کرتا ہے۔ جب منطقی طور پر کوئی چیز اس سے متقدم ہے ہی نہیں تو اس کا علم اپنے شعور ذات سے سوا ہو

ہی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا علم ذات بھی مطلق طور پر سادہ اور کثرت سے پاک ہو گا۔ اور اسکا شعور ذات مشتمل کس چیز پہ ہو گا ، یہ کہ صرف وہی واجب الوجود ہستی ہے اور ہر ممکن الوجود ہستی اسی پر منحصر ہے۔ یہاں شیخ الرئيس ابن سینا اپنے نظریہ علت کا ایک اہم اصول ”ایک سے ایک کاصدور“ متعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کے مطلق سادہ اور واحد علم سے ایک ہی چیز صادر ہو گی جسے ابن سینا عقل اول کا نام دیتا ہے۔

ابو حامد محمد ابن محمد الغزالی (1058-1111ء) اپنے زمانے کے مشہور مذہبی سکالر اور متکلم تھے جو بعد میں تصوف کی طرف چلے گئے۔ الغزالی ، مذہبی بنیاد پر ابن سینا کے نظریہ علیت سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا ایمان تھا کہ جو کچھ اللہ ، اس کے اسماء الحسنی ، اور نیچر کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے ، وہ قطعاً غلط نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو نظریہ قرآنی تعلیمات سے متصادم ہو ، کتنی بھی فلسفیانہ قابلیت کے ساتھ کیوں نہ تشکیل دیا گیا ہو ، قطعاً درست نہیں ہو سکتا۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کو قرآن پاک کے مقابل صداقت کا درجہ کبھی بھی نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں ذرہ برابر شک نہیں تھا کہ شیخ الرئيس ابن سینا کی کمال ذات (پرفیکشن) اور ارادے کی تعریف، جس کی بنا پر وہ اللہ کے صاحب ارادہ ہونے سے انکار پر مجبور ہوا، خدا کی مطلق سادہ نوعیت کا نظریہ، جس سے وہ علم الہی کی وحدت ، کلیت اور ازلیت اخذ کرتا ہے، علم الہی کی کلیت اور ازلیت کا نظریہ جس سے وہ خدا کے علم جزئیات کے انکار پر مجبور ہوا، خدا کا بطور علت العلل تصور اور نظریہ علیت ، اپنے تمام جبریتی مضمرات کے ساتھ صریحاً باطل تھے۔ الغزالی کو مطلق یقین تھا کہ قرآن پاک کے ہفت افلاک پر مشتمل تصور کا ثنات کے مقابل ثو افلاک پر مشتمل فلکیات کبھی بھی درست نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی یہ پختگی الغزالی کو وہ قابلیت عطا کرتی ہے جس سے وہ ارسطو اور شیخ الرئيس ابن سینا کے نظریات میں پائے جانے والے تناقضات اور منطقی تضادات کو پہچان لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور قرآن پاک کی مطابقت میں ان تصورات کی تشکیل نو اس طرح کرتے ہیں کہ ’ارادہ الہی‘ ذات باری کی شان بن جاتاہے۔ اس تعبیر کے مطابق ’ارادہ الہی‘ دو متناقض یا متقابل ممکنات میں سے کسی ایک کو، بغیر کسی اصول ترجیح کے ، اختیار کر لینے کا نام ہے۔ کائنات نہیں تھی۔ اس کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی اضافہ نہ ہوتا، اور تخلیق نہ کرنا شان میں کسی کمی کا باعث نہ ہوتا۔ بغیر کسی اصول ترجیح کے اللہ تعالیٰ نے چاہا اور اسے تخلیق کر دیا۔ یہ تعریف ارادہ الہی کو ایک شان بنا دیتی ہے اور کمال مطلق (پرفیکشن) کے اس یونانی تصور کو جو خدا کے عدم تغیر (immutability) پر منتج ہوتا ہے، مسترد کرتی ہے۔ الغزالی ، ابن سینا کے تصور خدا بطور علت العلل اور اس کے تمام مضمرات کا بھی استرداد کرتے ہیں۔ الغزالی کا ایمان تھا کہ قرآن ’الحق‘ ہے۔ جو نظریہ قرآن پاک سے متصادم ہے، وہ یقیناً ناقص ہے اور اس کا تضاد اس کے اپنے اندر موجود ہے۔ قرآن پاک کی صداقت پر ایمان الغزالی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ ابن سینا اور ارسطو کی فکر میں ان تضادات کی نشاندہی کر لیتے ہیں۔ اس تنقیدی جائزہ کے دوران الغزالی کا اپنا نظریہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ الغزالی خدا کا تصور پیش کرتے ہیں جو اپنے ارادے اور امر سے نظام کائنات ایڈمنسٹر کر رہا ہے۔ ابن سینا کے ازلیت کائنات کے تصور کو مسترد کر کے الغزالی ایک حادث کائنات کیلئے استدلال کرتے ہیں، جس کے ساتھ ہی زمان کا آغاز ہوتا ہے۔ ابن سینا کے علت معلول کے منطقی لزوم کے تعلق کا استرداد کر کے وہ نفسیاتی لزوم کا تعلق پیش کرتے ہیں۔ الغزالی یہ نظریہ گیارہویں صدی عیسوی میں پیش کر رہے ہیں، جب کہ ایک جدید مغربی فلسفی ہیوم اٹھارویں صدی عیسوی میں اسی نظریہ کی تصدیق کرتا ہے۔ جدید فلسفہ اور سائنس علت اور معلول کے مابین کسی منطقی لزوم کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح الغزالی اس بات کو مسترد کرتے ہیں کہ علت کوئی سادہ ، وحدانی، واقعہ (unitary event) ہوتی ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ علت ایک مرکب واقعہ (composite event) ہوتی ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ بھی قطعاً ضروری نہیں کہ ایک معلول ہمیشہ ایک ہی خاص علت سے پیدا ہو۔ برٹریڈ رسل (1872-1970ء) اسی نظریہ کا اثبات بیسویں صدی میں کرتا ہے۔ الغزالی ، مسلم فلسفیوں کے ’ایک سے ایک کے صدور‘ کے نظریے کا بھی استرداد کرتے ہیں۔ الغزالی استدلال کرتے ہیں کہ ایک ہی معلول کے مختلف علتوں سے پیدا ہونے (multiple realizability of effects) میں کوئی منطقی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ انیسویں صدی

کے مشہور فلسفی اور اکانومسٹ جان سٹوارٹ مل (1806-1872) نے اپنے علتوں کی تکثیر (plurality of causes) کے نظریے کے ذریعے اسی بات کی تصدیق کی۔

مسلم فکر کی تاریخ میں یہ بہترین مثال ہے حضرت علامہ اقبال کے اس تصور کی جسے باسط بلال کوشل قرآنی تناظر میں سائنسی اور فلسفیانہ فکر کی تعبیر، اور سائنسی اور فلسفیانہ فکر کے تناظر میں مذہب کی تعبیر کا نام دیتے ہیں اور جو حضرت علامہ کے خیال میں ہمیں مذہبی علم کا وہ سائنٹیفک ورژن (scientific form of religious knowledge) مہیا کر سکے گاجس کا ہونا اس باطنی تجربہ کیلئے لازم ہے جس پر ایمان کی حتمی بنیاد ہے۔ آئیے اس تناظر میں حضرت علامہ کے نظریہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال کے نظریات کا تنقیدی جائزہ

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے ساتھ جنم لینے والے نیچرل ازم کا زمان۔ مکان مسلسلہ (space-time continuum) جو زمان کو مکان کا چوتھا بُعد قرار دیتا ہے، عالم طبیعی کے تجربہ کی، جدید سائنٹیفک تعبیر ہے۔ اس سے آئن سٹائن (1879-1955ء) کے نظریہ زمان کے مضمرات کے طور پر ہم وقتیت (simultaneity) کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علامہ کا ایک مشہور ہمعصر فلسفی برگساں (1859-1941ء) آئن سٹائن کے نظریہ زمان کے مضمرات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا اور زمان اور حقیقت مطلق کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ’تصور زمان‘ حضرت علامہ کے دور کے سائنسی اور فلسفیانہ غور و فکر کے موضوعات میں بنیادی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ حیاتیات اور نفسیات بھی اسی زمانہ میں سائنسی علوم کی حیثیت سے وجود میں آتے ہیں اور حیات کی نوعیت، خودی کی نوعیت اور زمان کے ساتھ انکے تعلق کے مسائل ان علوم کے مباحث میں مرکزی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس طرح جدیدیت (modernity) زمان، حیات، سیلف (خودی) اور خودی کی خود اختیاری (autonomy of self) کے مسائل کی صورت میں حضرت علامہ کے سامنے منکشف ہوتی ہے۔ مسلم مفکر کی حیثیت سے حضرت علامہ نے یہ چاہا کہ جدیدیت کے ان نمائندہ مسائل کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کریں۔ برگساں، زمان کو حقیقت مطلقہ کی اصلیت (time as essence of ultimate reality) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال، برگساں کے اس تصور سے متاثر ہوتے ہیں۔ نفسیات نے فرد کے باطنی کوائف و احوال کے مطالعہ کیلئے درون بینی (introspection) کا طریقہ متعارف کرایا تھا۔ حضرت علامہ کو، ان دو تصورات میں فلسفہ و خودی کی تشکیل اور وجود باری کے اثبات کا امکان دیکھائی دیتا ہے۔ وجود باری کے اثبات کے روایتی استدلال کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکے تھے۔ سوال یہ تھا کہ زمان اور ذات کو کیسے متصل کیا جائے۔ درون بینی (انٹرو سپیکشن) کے ذریعے علامہ اقبال ’سیلف‘ کا تصور ’خودی‘ کی حیثیت سے کرتے ہیں یعنی وہ چیز جو اپنا شعور ذات ’میں‘ (I-am) کہہ کر کرتی ہے۔ انکا استدلال یہ ہے کہ ’حیات‘ اور ’سیلف‘ کا ’زمان‘ کے بغیر تصور محال ہے۔ انکے خیال میں ’زمان‘ ہر شے کی ایسنس ہے۔ اسی بات کو وہ خدا پر بھی عائد کرتے ہیں۔ انسانی خودی کی مماثلت پر جب وہ خدا کو خودی و مطلق کہتے ہیں، ابدی حال (eternal now) یا دوران خالص (pure duration) کی حیثیت سے ’زمان الہی‘ کا تصور کر کے اسے خودی و مطلق کا لازمی فیکٹر قرار دیتے ہیں۔ قرآن پاک سے اپنے نظریہ کی تصدیق نہ پا سکنے کے بعد وہ ذخیرہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں انہیں ایسی ایک روایت مل جاتی ہے جس کی بنیاد پر وہ خدا اور زمان کو ایک دوسرے کا عین قرار دیتے ہوئے، مذہبی علم کو سائنٹیفک فارم (scientific form of religious knowledge) میں تشکیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ روایت معمولی اختلاف کے ساتھ پانچ مختلف صورتوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ہم اپنے مضمون ’’کیا اللہ الدھر ہے!‘‘ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پانچویں روایت سے اگر صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اور الدھر (زمانہ) ایک دوسرے کا عین ہیں، تو پہلی اور چوتھی روایت سے اس کے بالکل متضاد نتیجہ اخذ ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ اور الدھر (زمانہ) ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں۔ (دوسری اور تیسری روایت کی تاویل دونوں طرح ممکن ہے۔) اگر پہلی اور چوتھی روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی فرمائی ہوئی ہیں تو پھر آخری یعنی پانچویں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ یا پھر لازم ہے کہ روایت کے دوسرے، تیسرے اور پانچویں ورژن کی تاویل محکمت کی مطابقت میں اس طرح کی جائے کہ پہلے اور چوتھے ورژن کے ساتھ ان کا تضاد باقی نہ رہے (صحیح مسلم، 421-22)۔^{iv}

کیا کوئی روایت جس کی قرآن پاک سے تصدیق نہ ہو سکے، جو لفظی معنوں میں قرآن پاک سے متناقض ہو، حضور نبی پاک ﷺ کی فرمائی ہوئی بات ہو سکتی ہے! کیا ایسی روایت سند ہو سکتی ہے! کیا ایسی روایت کو بنیاد بنا کر مذہب اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش صحیح سمت میں ہو گی! کیا ضروری نہیں کہ عقائد سے متعلق روایت کی ایسی تاویل کی جائے جو محکمت سے ہم آہنگ ہو! اگر ”زمانہ اللہ ہے/اللہ زمانہ ہے“ تو کیا زمانہ، غیر مخلوق اور قدیم نہیں بن جاتا۔ کیا زمان کی ازلیت اور غیر مخلوق ہونا کائنات کو غیر مخلوق اور قدیم نہیں بنا دیتا! کیا ابن سینا، سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کے فلسفے میں کوئی فرق رہ جاتا ہے! اگر ”زمان ذات باری کا ایک لازمی فیکٹر ہے۔“ تو کیا برگساں اور اقبال ذات باری کے ایک لازمی جز کو دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو گئے، جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٤٢﴾ (القرآن، 42:11) کیا انسانی عقل، ذات باری کا احاطہ کر سکتی ہے!

فلسفہ اقبال کے اصولوں میں سے ایک جس پر ان کے ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کی بنیاد ہے، ”انسانی خودی کی مماثلت پر خدا کو خودیء مطلق متصور کرنا ہے۔“ فلسفہ اقبال کا دوسرا اصول ”خدا اور زمان کی عینیت“ ہے۔ یہ دونوں اصول بحوالہ آیت نمبر 42:11 خلاف حق ہیں۔ اسی اصول عینیت کو ڈاکٹر باسط بلال کوشل ”اقبال کا زمانے کا قرآنی سائنسی تصور“ (Iqbal's Qur'anic-scientific conception of time) قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کوشل ”تحریک، خلاقیت، اور آزادی کی صفات کو خدا اور زمان کی مشترک خصوصیات قرار دے کر اقبال کے ’خدا اور زمان کی عینیت‘ کے نظریے کو جواز مہیا کرتے ہیں۔“ چونکہ یہ مضمون صرف اقبال ہی کی ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے تنقیدی جائزہ پر مشتمل نہیں ہے، اسلئے زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اگر حضرت علامہ کی ”اللہ اور زمانہ کی عینیت“ قرآن پاک سے ثابت ہو جاتی ہے تو اس عینیت کے اخلاقیاتی، وجودیاتی و دیگر فلسفیانہ مضمرات بھی—جو اقبال اخذ کرتے ہیں درست قرار پا سکیں گے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو کیا حضرت علامہ کے اخلاص نیت، اور علمی درجے کے اعتراف کے باوجود ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہونگے کہ حضرت علامہ کی مساعی بھی الشیخ رئیس ابن سینا اور سر سید احمد خان کی مساعی کی طرح درست سمت میں نہیں تھیں، اس اصول کے مضمرات جو حضرت علامہ اخذ کرتے ہیں، بھی محل نظر ہیں اور جن علماء نے نہایت اخلاص اور محنت کے ساتھ حضرت علامہ کے ”خدا اور زمان کی عینیت“ کے نظریہ کی ”قرآنی-سائنسی تصور زمان“ جیسی اصطلاحات میں توضیح کر کے اسے عین قرآنی تعلیمات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی قابل قدر مساعی کے باوصف کامیاب نہیں ہو سکے۔ آئیے قرآن پاک کے تناظر میں اس ’اللہ-زمان‘ عینیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

باسط بلال کوشل صاحب فرماتے ہیں کہ ”اقبال یہ ثابت کرنے کیلئے کہ قرآن پاک ’زمان‘ کو خدا کی عظیم ترین علامت (symbol) قرار دیتا ہے، قرآن پاک کے تین مقامات سے حوالے دیتے ہیں، پھر اسے پانچ مزید حوالوں سے سپورٹ کرتے ہیں۔ باسط بلال صاحب کہتے ہیں کہ ان آیات سے خدا اور زمان کا جو تعلق سامنے آتا ہے اسے اقبال ایک حدیث کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ”زمان ہی خدا ہے۔“ ہم نے اپنے مضمون ”کیا اللہ الذہر ہے!“ میں قرآن پاک کے ان آٹھ مقامات کا جائزہ لیا ہے کہ کیا واقعی ’خدا اور زمان کی عینیت‘ کا نظریہ وہاں سے اخذ ہو سکتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کسی بھی معقول تفسیر یا تاویل کے ذریعے ان آیات سے ”زمانہ ہی خدا ہے۔“ کے مفہوم کو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ہم نے مذکورہ حدیث کی اس تاویل کی، جسے حضرت علامہ نے اپنے لیکچرز میں استعمال کیا ہے، توثیق کیلئے قرآن پاک سے رجوع کیا تو ہم نے دیکھا کہ ’الذہر‘ کا لفظ پورے قرآن پاک میں صرف دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورہ الجاثیہ میں (45:24) اور دوسرے سورہ الذہر میں (76:11) جسے سورہ الانسان بھی کہا جاتا ہے، اور ان میں سے کسی بھی مقام پر ’الذہر‘ سے مراد اللہ لینے کا قطعاً کوئی قرینہ نہیں۔ جب اللہ قرآن پاک میں اپنے لئے ’الذہر‘ کا لفظ استعمال ہی نہیں کرتا تو حضرت علامہ کس اٹھارٹی پرایک حدیث کی پانچ مختلف روایات میں سے اس روایت کو قبول کرنے یا اسکی ایسی تاویل کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں جو قرآن پاک میں اللہ کے تصور سے متصادم ہے یا

نظریہ ء تخلیق اور نظریہ ء ارتقا کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش --- ڈاکٹر اسرار احمد

”اس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے قرآن اور حدیث سے مختلف حوالوں کے مابین تقابل ، تطابق اور مماثلت کے ذریعہ نظریہ تخلیق کائنات اور سائنسی نظریہ ارتقاء میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔“ ڈاکٹر ابصار احمد مزید لکھتے ہیں۔ ”اس تحقیق کا منشاء تخلیق اور ارتقاء کے متمیز لیکن بعض اعتبار سے مماثل دائروں، جن کا وجود میں لانے والا ایک ہی قادر مطلق ہے، پر سوالات کے ضمن میں قرآنی پوزیشن کو واضح کرنا ہے۔“ وہ مزید لکھتے ہیں: ”ڈاکٹر اسرار احمد انسان کی وجودیاتی ثنویت (ontological dualism of man) کے قائل ہیں اور عمل ارتقاء کو انسان کے صرف جسمانی پہلو تک محدود کرتے ہوئے، اسکی توثیق کرتے ہیں۔“

”مسلم الہیات کے مطابق [صرف ذات باری تعالیٰ واجب الوجود، اور قدیم ہے۔ جبکہ کل کون و مکان اور انسان سمیت جملہ موجودات ”ممکن“ اور ”حادث“ ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ”وجوب“ سے ”امکان“ اور ”قدیم“ سے ”حدوث“ کا سفر کیسے اور کن مراحل سے گزر کر طے ہوا۔۔۔۔۔ اور اس طویل سفر میں ”تنزل“ ہی ”تنزل“ ہے یا کوئی مرحلہ ارتقاء کا بھی آیا ہے (ایجاد و ابداع عالم 5، n.d.)؟“

یہ وہ مسائل ہیں جو متکلمین اور فلسفیوں میں موضوع بحث رہے ہیں۔ درج بالا اصطلاحات جو ڈاکٹر اسرار احمد نے استعمال کی ہیں یونانی مابعدالطبیعیات کی اصطلاحات ہیں۔ جب انہیں قرآنی مابعدالطبیعیات کے تناظر میں اٹھائے گئے سوالات میں استعمال کیا جاتا ہے تو صرف الجھاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ یہ دو قطبی تعلقات (polar concepts) ہیں اور جائز طور پر صرف ایک ہی دائرہ حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کیلئے استعمال کئے جانے چاہئیں۔ قرآنی ما بعد الطبیعیات سے پیدا ہونے والی وجودیات (Qur'anic ontology) تین کیٹیگریز پر مشتمل ہے۔ اللہ (خدا) ، خلق، اور امر۔ ذاتِ باری کے

سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس کی 'خلق' کی کیٹیگری سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے 'امر' کی کیٹیگری سے۔ 'خلق' کسی بھی اعتبار سے اللہ کی الوہیت میں شریک ہے، نہ 'امر'۔ خدا تمام تعینات، اور 'خلق' اور 'امر' کے ساتھ ہر قسم کی مماثلت سے یکسر پاک ہے۔ (The Qur'anic ontology and status of al-Haqq)۔ اصل بات یہ ہے کہ جب آپ خدا، اسکی صفات یا اسماء کے بارے میں غیر قرآنی اصطلاحات اختیار کر لیتے ہیں، تو آپ تناقضات اور الجھاؤ میں مبتلا ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ مسلم الہیات میں اسماء الحسنیٰ میں کوئی بھی اسم الہی 'perfection'، 'immutability'، 'timelessness'، 'eternity'، 'un-caused cause' and کے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مسلم فکر میں یہ غیر قرآنی اصطلاحات یونانیوں سے براہ راست آئیں یا عیسائیت کے واسطے سے داخل ہوئیں، اور ان میں سے کوئی بھی قرآنی تصور خدا کیلئے موزوں نہیں۔ مثال سے بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے چنانچہ مسلم کلام سے 'ذات' و صفات باری میں تعلق کی نوعیت کے مسئلہ کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

قرآنی مابعدالطبیعات میں اللہ کے اسکی 'ذات' (Essence) اور 'صفات' (Attributes) میں تقسیم کا کوئی تصور نہیں۔ یہ فلسفہ ارسطو کی اصطلاحات ہیں اور اسلامی مابعد الطبیعات سے غیر مطابق ہیں۔ اسلامی مابعد الطبیعات کی اصطلاح تو 'ذات مسمی' (Named) اور 'اسماء لحسنی' (Names) ہیں۔ جب مسلمانوں نے فلسفہ پڑھے ہوئے عیسائیوں سے مکالمے کے دوران 'ذات' اور 'صفات' کی اصطلاحات، انکے مضمرات کو جانے بغیر، قبول کر لیں، تو وہ مسائل میں الجھ گئے۔ 'ذات و صفات' باری میں تعلق کی نوعیت کا مسئلہ اسی الجھاؤ کے نتیجہ میں پیدا ہوا، جس سے پھر خلق قرآن کے مسئلہ نے جنم لیا (مسئلہ ذات و صفات، 28-43)۔

ایجاد و ابداع عالم کے مسئلہ پر ہماری دانست کے مطابق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ:

وحی الہی "ایجاد و ابداع" کی اساس اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" کو قرار دیتی ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کیلئے اس کا "کن" کہنا ہی کافی ہوتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے۔ (بحوالہ، یسین 82: (ایجاد و ابداع عالم، 6) اب ڈاکٹر اسرار احمد بغیر کسی سند کے، محض استعاراتی استدلال کے ذریعے، کلمہ "کن" کو "کلمات اللہ" کے مترادف ٹھہرا دیتے ہیں۔ آیات کریمہ نمبر "القرآن، 2:117، 3:47، 16:40، 19:35، 40:68، 36:82" جن کا ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے وہ "کن" کو امر الہی کے طور پر ریفر کرتی ہیں نا کہ لازماً "کلمۃ اللہ" کے طور پر۔ قرآن پاک میں "کلمۃ اللہ" سے مراد لازماً 'امر' یا امر "کن" نہیں ہے ہر مقام پر۔ ہم یہاں صرف ایک آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ وہ ترجمہ ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اپنے کتابچے سے لیا گیا ہے۔ "اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتا ہے تو (یس) کہتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے!" (یسین 82)

لفظ "کن" کا صحیح ترجمہ "امر" ہے نہ کہ "کلمہ"۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی امر "کن" کیلئے "کلمۃ اللہ" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کلمۃ اللہ کی جمع ہے کلمات اللہ۔ سورہ الکہف: 109 میں "کلمات ربی" اور سورہ لقمان: 27 میں "کلمات اللہ" کے لا تعداد ہونے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر "کن" کو "کلمۃ اللہ" پر منطبق کرنے کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد مذکورہ بالا آیات کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کے فرامین و فرمودات، اوامرو احکام، نوامیس و قوانین، فیصلوں اور طے شدہ امور کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو بھی اس کے "کلمات اللہ" میں شامل ٹھہراتے ہوئے، اللہ کی ہر مخلوق کو اللہ کے ایک کلمہ "کن" کا ظہور قرار دیتے ہیں (ایجاد و ابداع عالم، 7-8)۔ اس کے علاوہ اللہ نے تقدیر و ہدایت کا جو وعدہ فرمایا ہے، ڈاکٹر اسرار احمد آیت نمبر 3-87:1 کے حوالہ سے جمادات کی سطح پر قوانین طبعیہ، نباتات کی سطح پر حیاتیاتی قوانین، حیوانات کی سطح پر جبلی قوانین، اور انسان کے معاملہ میں استدلالی قوانین، جس سے بالا تر سطح ہے وحی ربانی کی۔ جملہ مخلوقات کے معاملہ میں جہاں تک کام ان قوانین کے تحت چلتا رہے، اللہ تعالیٰ کے کسی اضافی امر "کن" کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں ان میں کوئی بنیادی تبدیلی مطلوب ہو، یا اللہ تعالیٰ سلسلہ اسباب کو توڑ کر اپنی کسی خصوصی مشیت کا اظہار کرنا چاہے، تو ایک نئے امر "کن" کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد، امر "کن" کو "کلمۃ اللہ" اور وہاں سے "کلمات اللہ" میں تحویل کرنے کے بلا جواز اقدام کے مضمرات، پھر ان کے مضمرات اخذ کرنے کے غیر مختتم سلسلے میں داخل ہو جاتے ہیں

اور فرشتوں، ارواح، جنوں وغیرہ کی تخلیق کے موضوعات پر اس طرح بات کرتے ہیں کہ دیو مالائی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس بات کا بھی دھیان نہیں کرتے کہ بعض باتیں بے ادبی کے زمرے میں آ سکتی ہیں۔ ”ایجاد و ابداء عالم“ سے ایک اقتباس پیش ہے۔

”الغرض! ایجاد و ابداء سے تخلیق و تسوہ تک کے طویل سفر کا مرحلہ اول، با الفاظ دیگر سلسلہ ”تنزلات“ کی پہلی منزل، جس سے قرآن حکیم کی اہم اصطلاحات: کلمہ و کلمات، روح و وحی اور امر و نور متعلق ہیں، اغلباً یہ تھی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے امر ”کن“ نے ایک ایسے نہایت لطیف و بسیط، اور خنک و پر سکون ”نور“ کی صورت اختیار کر لی جس میں نہ حرارت و تپش تھی نہ حرکت و توجہ! اور اس مرحلہ پر اسی نور بسیط سے تخلیق کی گئیں دو صاحب تشخص، اور صرف صاحب شعور و ارادہ ہی نہیں بلکہ حامل شعور ذات (self conscious) مخلوقات، یعنی: ایک ”روح القدس“ اور ”الروح الامین“، یعنی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سمیت جملہ ملائکہ عظام۔۔۔ اور دوسرے روح آدم اور نسل آدم اور روح محمدی ﷺ سمیت ان تمام افراد کی ارواح جو تا قیامت پیدا ہونگے۔“ (ایجاد و ابداء عالم، 19)

یہ کیوں بلا جواز اقدام (illegitimate move) ہے، واضح کرنے کیلئے خلق قرآن کے مسئلہ پر اشاعرہ سے اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

اشاعرہ سے ایک متوازی مثال

”معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک ’مخلوق‘ اور ’حادث‘ (created and accident) ہے۔ وہ قرآن کے کلام الہی ہونے کے منکر نہ تھے لیکن قرآن مجید کے ’غیر مخلوق‘ اور ’قدیم‘ (uncreated and eternal) ہونے کے نظریہ کو عقیدہء توحید سے متصادم سمجھتے تھے۔ اشاعرہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک ’کلام اللہ‘ ہے۔ (9:06) ’کلام اللہ‘ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ ابوالحسن الاشعری نے سورہ الاعراف آیت نمبر 54 میں اس فرمان الہی سے ”سن لو! خلق بھی اسی کی ہے امر بھی اسی کا ہے۔“ استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ’خلق‘ اور ’امر‘ دو الگ کیٹیگریز ہیں۔ سورہ الزوم کی آیت نمبر 25 میں اس فرمان الہی سے کہ ”اور اس کی نشانیں سے ہے کہ زمین اور آسمان اسی کے امر سے قائم ہیں۔“ استدلال کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ کا کلام ہی اس کا ’امر‘ ہے، اللہ کی ’خلق‘ اس کے ’امر‘ سے قائم ہے۔ قرآن پاک ’کلام اللہ‘ ہے۔ اس لئے یہ ’خلق‘ نہیں بلکہ ’امر‘ کی کیٹیگری سے تعلق رکھتا ہے۔ ’امر‘ کا ’خلق‘ سے پہلے ہونا لازم ہے۔ ’امر‘ سے پہلے کسی ’امر‘ کو مانا جائے تو کسی اور ’امر‘ کا اس سے بھی پہلے ماننا لازم آئے گا۔ اس کو لا متناہی طور پر بڑھانا منطقی طور پر ناقابل فہم ہے۔ لہذا اللہ کا ’امر‘ اسکی صفت کلام میں مضمر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح حضرت ابو الحسن الاشعری کلام الہی کو (کلام نفسی کی صورت میں) اللہ کی صفت کلام کے اندر مضمر قرار دیکر استدلال کرتے ہیں کہ قرآن پاک قدیم ہے۔ ’غیر مخلوق کلام الہی‘ ازل سے خدا کی صفت کلام کے طور پر خدا کے ساتھ تھا، جسے ابتدائے آفرینش سے ایک ’غیر مخلوق ازلی قرآن‘ (pre-existent Quran) کی صورت میں لوح محفوظ پر رکھ دیا گیا جہاں کلام لفظی کی صورت میں اپنے نزول تک یہ موجود رہا (H. A. Wolfson and A. H. Kamali, 81-96)۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اللہ کے امر ”کن“ کو ’کلمۃ اللہ‘ اور ’کلمات اللہ‘ کے ساتھ، اور پھر اس کے فرامین و فرمودات، اوامرو احکام، نوامیس و قوانین، فیصلوں اور طے شدہ امور کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے ساتھ منطبق کرنا ویسا ہی خلاف حق (illegitimate) ہے جیسا اشاعرہ کا کلام اللہ کو اللہ کا امر قرار دیکر اسکی صفت کلام میں مضمر قرار دینا، اور صفت کلام کو ازل سے خدا کے ساتھ قرار دینا، کلام اللہ کو کلام نفسی کی صورت میں خدا کے ساتھ ازلی قرار دینا، اس طرح کلام اللہ (قرآن پاک) کے قدیم اور غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرنا خلاف حق تھا (The Qur'an: Creation or Command, 75-83)۔

اس کتاب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کام کا تعلق قرآن پاک کی بعض آیات متشابہات کی تاویل اور ان کے مضمرات اخذ کرنے سے ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں قرآن پاک اس سلسلے میں کیا رہنمائی دیتا ہے، کیا ڈاکٹر صاحب اسے ملحوظ رکھ پائے ہیں، بلکہ کیا انھیں اس اصول کا ادراک بھی ہے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی۔ اس کی کچھ آیات محکمت ہیں۔ وہ اُمّ الکتاب ہیں۔ اور دوسری متشابہات ہیں۔ وہ جن کے قلوب میں کجی ہے، متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ چاہنے کو اور اسکی تاویل چاہنے کو۔ اور اسکی تاویل کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور علم میں راسخ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔ اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔“ (آل عمران، 3:7)

کتاب اللہ کی آیات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو براہ راست احکام کی شکل میں ہیں۔ دوسری وہ ہیں جن کے پڑھ لینے سے اور سن لینے سے اس بیان کے مطابق ہم پر حق عاید ہو جاتا ہے۔ پہلی محکمت ہیں، اور دوسری متشابہات۔ اُمّ الکتاب کا درجہ محکمت کو حاصل ہے، کہ ہر فیصلے میں معیار یہی محکمت ہیں۔ کیا اس آیت پاک سے متشابہات کی تاویل کا یہ اصول اخذ نہیں ہوتا کہ متشابہات کی وہی تعبیر درست ہوگی جس کی بنیاد محکمت پر ہو! ورنہ اس تعبیر کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا۔ اب ملاحظہ فرمائیں کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔

سورہ یسین کی آیت کریمہ ”اس کے آمر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے!“ (یسین: 82) جس سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی فلسفیانہ قیاس آرائی کا آغاز کیا ہے، کیا یہ آیت متشابہات میں سے نہیں؟ ”اگر زمین کے کل درخت قلم بن جائیں اور سمندر (سیابی کا کام دے اور) اسکے بعد سات سمندر اور ہوں مدد کیلئے، تب بھی ”اللہ کے کلمات“ ختم نہ ہوں گے۔“ (لقمن: 27) کیا یہ آیت کریمہ بھی متشابہات میں سے نہیں! پہلی متشابہ آیت میں ”أمر“ ”کُن“ کو دوسری متشابہ آیت کریمہ کے ”کلمات اللہ“ سے محکمت میں سے کس آیت کریمہ کی بنیاد پر مطابقت دی گئی ہے! ہماری دانست میں یہ ساری کتاب متشابہات کی متشابہات، روایات، اقوال و اشعار صوفیاء اور قیاسات کی بنیاد پر تاویل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اس کا مقصد تنزل کے غیر قرآنی اور ارتقاء کے تھیوریٹیکل سائنسی تصور کیلئے گنجائش پیدا کرنا ہے۔

تنقیدی جائزہ

اس مطالعہ کا مقصد ان صاحبان علم و دانش کی مساعی کی تنقیص نہیں جنہوں نے اپنے شب و روز ’الہامی علم‘ اور ’علم کسب‘ کے مابین رشتہ و تعلق کے بنیادی اصول وضع کرنے میں صرف کر دیے۔ یہ سب علمی محاکمہ ہے جس پر ہمیں حتمیت کا کوئی دعویٰ نہیں۔ ذاتی حیثیت میں الشیخ الرئيس ابن سینا، سر سید احمد خاں، حضرت علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے ایک علمی مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کا حل تلاش کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کیا۔ مقصد کام کو آگے بڑھانا اور اپنی صلاحیت کے مطابق حق کو روشن کرنا ہے۔ ابن سینا کے نظریات پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ سر سید احمد خاں کے معاملہ میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کا پیش کردہ اصول ”کلام اللہ“ اور ”کائنات کی سائنسی تعبیر“ میں اختلاف کی صورت میں سائنسی نقطہ نظر کو فوقیت حاصل ہو گی، اور کلام اللہ کی مپٹا فاریکل تعبیر اس طرح کی جائے گی کہ تناقض باقی نہ رہے۔“ درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ علم الہی کو کسبی علوم کے تابع کرنے والی بات ہے جس کا مظاہرہ ہم الشیخ الرئيس ابن سینا کے معاملہ میں دیکھ چکے ہیں۔ کسبی علوم (سائنسی اور فلسفیانہ علوم) اور ان کے ساتھ وجود میں آنے والا نظریہ کائنات (ورلڈ ویو) بدلتا رہتا ہے۔ تو عقلی علوم میں ہر تبدیلی کے ساتھ کیا ہم از سر نو قرآن کی نئی تعبیر کر کے اسے نئے عقلی علوم سے ہم آہنگ کرنے میں جت جایا کریں گے۔ سر سید احمد خاں نیوٹن کے میکانیکی نظریہ کائنات اور نیچرل ازم کی مطابقت میں قرآن پاک کی تعبیر کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ آئن سٹائن نے نیا ورلڈ ویو اور نیا نیچرل ازم دے دیا، نئے سائنسی اور فلسفیانہ علوم کو علم الہی کے ساتھ از سر نو مطابقت دینے کیلئے حضرت علامہ اقبال کو زندگی کی بہترین صلاحیتیں صرف کرنا پڑیں۔ ایسے نظریہ کائنات کی جس میں آسمانوں کا کوئی تصور نہ ہو، ایسے نظریہ کائنات سے مطابقت جو ٹھیک سات آسمانوں پر یقین رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ”کلام اللہ“ اور ”کائنات کی سائنسی تعبیر“ میں اختلاف کی صورت میں فوقیت کس کو ہونی چاہئے۔“ بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ وحی الہی پر مبنی علم (جسے ہم علم الہی کہیں گے) اور علم کسب (کسی بھی زمانے کے سائنسی اور فلسفیانہ علوم) کے مابین رشتہ و تعلق

کے بنیادی الہیاتی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ اس مضمون میں اسی سلسلہ میں اپنا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عصری نظریات:

ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر اسحاق ظفر انصاری، مولانا وحید الدین خاں و دیگر۔

ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر اسحاق ظفر انصاری، مولانا وحید الدین خاں اور بہت سے دیگر حضرات عقلی و تجربی علوم (فلسفہ و سائنس) میں مسلمانوں کے دیگر قوموں سے پیچھے رہ جانے کی وجہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی غیر درست تعبیر کو قرار دیتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ سے فرماتا ہے کہ ”آپ مومنین سے فرما دیجئے کہ اگر وہ اللہ کی حب چاہتے ہیں تو آپ کا اتباع کریں؛ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ انہیں اپنا حبیب بنا لے گا۔“ (آل عمران: 31) وہ سمجھتے ہیں کہ اس حکم کی غیر مشروط تعبیر ایک مسلم سائنسدان کو کھلے ذہن کے ساتھ ریسرچ کرنے کی آزادی نہیں دیتی۔ اسے ہر وقت فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں اس حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اس مسئلہ کا حل وہ نبی پاک کی ذات گرامی کی مختلف حیثیتوں میں تقسیم کی صورت میں تجویز کرتے ہیں۔ انکی دانست میں نبوت و رسالت آپ ﷺ کی ذات اقدس کی ایک حیثیت ہے اور صرف اسی حیثیت میں فرمائے گئے حکم میں آپ ﷺ کا اتباع لازم ہے، اور وہ بھی صرف معاملات دین میں۔ دنیاوی معاملات میں، ان کا خیال ہے کہ، کوئی شخص (اللہ انہیں معاف فرمائے) حضور پاک ﷺ سے زیادہ علم والا ہو سکتا ہے۔ یہ ان حضرات کی پیراڈائم کے اہم نکات ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ قرآنی تعلیمات کے یکسر منافی ہے۔ رسالت و نبوت کو آپ ﷺ کی ذات اقدس کی صرف ایک حیثیت بنا کر دراصل دین میں اپنی پسند اور نا پسند کو داخل کرنے کی بہت گنجائش پیدا ہو جاتی ہے (خلافت کے اقتصادی نظام کی اصولی اساس، 10)۔^{vi}

قرآن کی سائنسی تعبیر _____ مورس بکائل (1920-1998ء)

یہ پوزیشن ”مسلمہ سائنسی حقائق“ (established scientific facts) اور ”سائنسی تھیوریز“ (scientific theories) میں فرق کرتی ہے۔ اور قرآن پاک میں سائنسی اہمیت کے حامل بیانات کے جدید سائنس کے دریافت کردہ مسلمہ سائنسی حقائق کے ساتھ تقابل کے ذریعے قرآن پاک کے الہامی (divine origin) ہو نے پر استدلال کرتی ہے۔ جو شخص پہلے سے ہی قرآن پاک کو الہامی مانتا ہو، اس قسم کے مطالعات سے اس کے ایمان کو یقیناً تقویت پہنچتی ہے اور جو ایسا نہ ہو اسے قرآن پاک پر سنجیدہ غورو فکر کی تحریک ملتی ہے۔ جو سائنسی حقائق ہم آج دریافت کر رہے ہیں، تقریباً سوا چودہ سو سال پہلے وجود میں آنے والی کتاب میں ان کا پایا جانا یقیناً خوشگوار حیرت کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کتاب کا دعویٰ الہامی ہونے کا ہو تو اس کتاب کی باقی تعلیمات اور دعاوی بھی سنجیدہ مطالعہ و تحقیق کے متقاضی ٹھہرتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ سائنسی نظریہ کا ثبات حتمی نہیں ہوتا اور سائنسی تحقیق کے نتائج اور ان کی تعبیر بدلتی رہتی ہے، سوال پیدا ہوتا ہے اگر قرآن پاک کے چودہ سو سال پہلے کے بعض بیانات کسی زمانے کی سائنسی تحقیق کے بعض نتائج کے ساتھ ہم آہنگ پائے بھی جائیں تو اس تطابق کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے! مورس بکائل مکتب فکر ”مسلمہ سائنسی حقائق“ اور ”سائنسی تھیوریز“ میں فرق واضح کر کے اس سوال کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ: ”سائنسی تھیوری“، حتمی نہیں ہوتی، جبکہ ”مسلمہ سائنسی حقائق“ حتمی اور ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں۔ قرآن کے بیانات الہامی ہیں۔ قرآن کے الہامی بیانات مسلمہ سائنسی حقائق سے کبھی بھی متناقض نہیں ہوئے اور نہ کبھی ہوں گے۔ سائنسی تھیوری کو کبھی بھی سائنسی صداقت تصور نہیں کیا جانا چاہئے اور نا قرآن کے الہامی بیانات کو اس کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرنی چاہیے، اور نہ ان کے قرآن پاک سے تناقض کو قرآن پاک کے خلاف عقل ہونے پر محمول کرنا چاہئے (The Islamization of Science 1996, 240)۔ سائنسی تھیوری، سائنسی مشاہدات اور مظاہر کی قیاسی تعبیر ہوتی ہے جو واقعات کی پیش گوئی، فطرت پر کنٹرول اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں معاونت کی حد تک اہم ہوتی ہے۔ ان تھیوریز سے جو نظریہ کائنات تشکیل پاتے ہیں وہ بھی قیاسی ہوتے ہیں۔ بطمیموسی نظریہ کائنات، ابن سینا کا نظریہ صدور، نیوٹن کا میکانیکی نظریہ کائنات اور آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت سائنسی نظریہ کائنات کی مثالیں جبکہ ابن

سینا، ہیوم، رسل، مل کے علت - معلول کے بارے میں نظریات ، ایتھر ، یا میٹرل فیلڈ کی تھیوری، کشش ثقل ، بلیک ہولز ، کہکشاؤں وغیرہ کے بارے میں تھیوری، بگ-بینگ، کوانٹم مکینکس وغیرہ سائنسی تھیوری کی مثالیں ہیں۔ اب آتے ہیں مسلمہ سائنسی حقائق کی طرف۔ ایک زمانے تک زمین کو طشتری کی طرح چپٹی خیال کیا جاتا تھا۔ پھر سائنسدانوں کا یہ نظریہ بنا کہ زمین کروئی یا مدور ہے۔ لیکن ابھی بھی یہ صرف تھیوری تھی۔ سائنس کی کتابوں میں زمین کے کروئی ہونے کے ثبوت کیلئے عقلی دلائل بیان کئے جاتے تھے۔ ابھی تک زمین کا کروئی ہونا صرف ایک سائنسی تھیوری تھی۔ پھر جہاز اور خلائی سیارے ایجاد ہو گئے جو زمین کے گرد چکر لگا سکتے تھے۔ اب ہمارے خلائی سٹیشن خلا سے زمین کے ہر حصے کی تصویریں لے کر بھیجتے رہتے ہیں جنہوں نے زمین کے گرد چکر لگا کر ناقابل تردید طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زمین کروئی/بیضوی (elliptical) ہے۔ اب زمین کا کروئی/بیضوی ہونا ایک مسلمہ سائنسٹک فیکٹ ہے۔ مسلمہ سائنسٹک فیکٹ کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ایک مدت تک سائنسدان یہ نہیں جانتے تھے کہ مادہ اور انرجی دو الگ جوہری حقیقتیں ہیں یا ایک ہی طبیعی حقیقت کے دو روپ۔ چنانچہ مختلف تھیوریز موجود تھیں۔ اُن سٹائن نے مادے اور انرجی کو ایک ہی حقیقت کے دو روپ قرار دیا اور ان دونوں کے ایک دوسرے میں تبادل پذیر (convertibility) کی پیمائش کیلئے ایک ریاضیاتی فارمولا وضع کیا۔ لیکن ابھی تک یہ تصور صرف ایک تھیوری تھا۔ سائنسی تجربات کے ذریعے اس تھیوری کی حتمی تصدیق کے بعد مادہ اور انرجی کی تبادل پذیر (interconvertibility) ایک مسلمہ سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔ ایٹم کی تقسیم پذیری یا عدم تقسیم پذیری کے بارے میں مدت تک صرف تھیوریز تھیں۔ اب یہ بات اس حد تک کہ ایٹم کا ایک سٹرکچر ہوتا ہے، اور اسے توڑا جا سکتا ہے، ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔ کائنات کی ساخت (structure) کے حوالے سے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”ہم نے ٹھیک سات آسمان بنائے۔“ (القرآن، 78:12) فرمایا: ”تخلیق سے پہلے آسمان دھواں تھے۔“ (خم سجدہ /فصلت، 41:12) یہ بھی ارشاد ہے: ”پھر ہم نے انہیں دو دن میں پورے سات آسمان کر دیا، اور آسمان میں اس کے امر کی وحی فرمائی۔“ (41:12) ”ہم نے انہیں دو دن میں تخلیق کیا۔“ (خم سجدہ /فصلت، 41:12) یہ بھی ارشاد ہے: ہم نے آسمانوں کو تھاما ہوا ہے کہ گر نہ جائیں۔ (حج، 22:65) اس طرح اور بھی کئی ارشاد ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہے: ”زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا گیا۔“ (القرآن، 21:32) زمین کو دو دن میں بنایا گیا۔ (القرآن، 41:9) زمین ، اس کے اوپر پہاڑ، برکات، خوراکیں ٹھہرائیں گئیں ، کل چار دن میں۔ (41:10) کائنات کی تخلیق کے متعلق فرمایا گیا ہے ، کہ زمین اور آسمان بند تھے ، اللہ نے انہیں کھولا۔ (انبیاء ، 21:30) (آسمان کو ابتدائی صورت میں بھی اللہ ہی نے پیدا کیا تھا۔) ”زمین کو فرش بنایا۔“ (نوح، 71:17) زمین اور آسمان، دونوں سے فرمایا گیا، ”طوعاً مانو یا کرہاً مانو، دونوں نے برضا و رغبت احکام الہی کی تعمیل کا عہد کیا۔“ (41:11) آسمان کائنات کی مادی ساخت کا حصہ ہیں۔ یہ کائنات کی مادی ساخت کے بارے سائنسی اہمیت کے حامل قرآنی بیانات ہیں۔ بطلموسی سائنسی تھیوری میں نو آسمانوں کا تصور تھا۔ یہ محض قیاسی نظریہ (تھیوری) تھی۔ نیوٹن کی میکانیکی تھیوری میں آسمانوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ نیوٹن کا میکانیکی کائنات کا نظریہ ماضی کا واقعہ بن چکا ہے۔ اُن سٹائن کے نظریہ اضافیت (theory of relativity) میں بھی آسمانوں کا کوئی تصور نہیں۔ نظریہ اضافیت کوئی مسلمہ سائنسی حقیقت نہیں۔ یہ کائنات کے سٹرکچر کے بارے میں اسی طرح کی تھیوری ہے جیسی کہ اس سے پہلے نیوٹن کی تھیوری تھی۔ جب کبھی سائنس، کائنات کے سٹرکچر کی تحقیق کرتے ہوئے آسمانوں کو دریافت کر لیتی ہے اور ’مادہ - انرجی‘ کی تبادل پذیر کی طرح سات آسمانوں کے وجود کی حتمی تصدیق کر لیتی ہے تو یہ مسلمہ سائنسی حقیقت (established scientific fact) بن جائے گا اور ثابت ہو گا کہ یہ بات سینکڑوں سال پہلے وجود میں آنے والی کتاب میں بغیر کسی ابہام کے موجود ہے۔ قرآن پاک میں فرعون کے بارے میں بیان ہے کہ غرق دریا ہوتے ہوئے اس نے ایمان لانا چاہا۔ فرمایا گیا اب تیرا ایمان قبول نہیں۔ ہم تیری لاش کو عبرت کیلئے باقی رکھیں گے۔ (القرآن، 10:91-92) صدیوں تک یہ سوال اٹھایا جاتا رہا کہ کدھر ہے فرعون کی لاش جسے عبرت کیلئے باقی رکھے جانے کا ذکر ہے قرآن پاک میں۔ اور پھر انیسویں صدی کے آخری ربع میں فرعون، جو غرق آب ہو کے مرا تھا، کی لاش دریافت ہو گئی اور قرآن پاک کے ایک بیان کی

تیرہ سو سال بعد ایک سائنسی حقیقت کی حیثیت سے تصدیق ہو گئی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ”ساعت قریب آگئی اور قمر شق ہوا۔“ (القمر، 54:1) اگر شق القمر ہو چکا ہے تو سائنس پوری حتمیت کے ساتھ اسی طرح ثابت کر لے گی جیسے فرعون کی لاش کے بارے میں ثابت کر چکی ہے، اگر یہ واقعہ ہونا باقی ہے قرب قیامت میں، تو اس طرح ہو گا کہ اس کا انکار ممکن نہیں ہو گا۔ اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ قرآن پاک کے بیانات کو کسی بھی زمانے کے سائنسی اور فلسفیانہ علوم سے ہم آہنگ کرنے کا بنیادی اصول جو مورس بکائل کی کتاب سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ’مسلمہ سائنسی حقائق‘ (established scientific fact) اور ’سائنسی تھیوری‘ (scientific theory) میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔ ’مسلمہ سائنسی حقائق‘ کبھی نہیں بدلتے اور کتاب اللہ کو الہامی ماننے والے کو ایمان رکھنا چاہئے کہ کبھی ان کا تضاد کتاب اللہ سے ہوا ہے، نہ ہو گا۔ سر سید احمد خان اپنے ’جدید علم الکلام‘ کے اس اصول کہ ”سائنس و فلسفہ“ اور ’کلام الہی‘ میں تناقض کی صورت میں کلام الہی کو استعاراتی تعبیر کے ذریعے سائنسی نقطہ نظر کے مطابق بنایا جائے گا۔“ میں ’مسلمہ سائنسی حقائق‘ اور ’سائنسی تھیوری‘ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ سر سید کی مجبوری تھی کہ سائنس ابھی بالکل نئی نئی ڈویلپ ہونا شروع ہوئی تھی، پیچیدہ ریاضیات پر مبنی نیوٹن کی مکینکس کی طرح کا سائنسی نظریہ اس سے پہلے معلوم ہسٹری میں موجود نہیں تھا، اس نظریہ سے ترقی پانے والے دنیا میں سیاسی اور فوجی غلبہ حاصل کر چکے تھے اور ہم اس وقت ان کے محکوم تھے۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب میں ایک اہم عصری سائنسی تھیوری ”نظریہ ارتقاء“ (theory of evolution) کے حوالے سے اسلامی مؤقف کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا احساس یہ ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی وہی غلطی دہرا رہے ہیں جس کا ارتکاب سر سید احمد خان سے ہوا یعنی (1) مسلمہ سائنسی حقائق اور ’سائنسی تھیوری‘ میں فرق ملحوظ نہ رکھنا، اور (2) قرآن پاک کی استعاراتی تفسیر کر کے اسے سائنسی تھیوریز کے ساتھ ہم آہنگ کرنا۔ آئیے ”تھیوری آف ایوولوشن“ پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

نظریہ ارتقاء ایک تھیوری ہے جس طرح نیوٹن کا کائنات کے میکانیکی، اور سہ ابعادی ہونے، ٹائم کے یک بُعدی حقیقت کی حیثیت سے کائنات سے الگ متوازی حقیقت ہونے کا نظریہ ایک سائنسی تھیوری تھا۔ جتنی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ نیوٹن کی تھیوری کو حاصل تھی اور جو صنعتی انقلاب اس کے نتیجے کے طور پر بالکل تھوڑے سے عرصے میں ہی آ گیا، نظریہ ارتقاء کو نہ تو اتنی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ حاصل ہے اور نہ اس کے محدود دائرے میں کوئی ایسا انقلاب برپا ہو سکا ہے۔ اس کے باوجود صرف دو صدیوں میں آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کی صورت میں کائنات کا یکسر مختلف نظریہ، ویسی ہی مضبوط ریاضیاتی سپورٹ کے ساتھ پیش کر دیا۔ کسی بھی وقت ویسی ہی ریاضیاتی اور تجرباتی سپورٹ کے ساتھ ایک یکسر مختلف تھیوری نظریہ اضافیت کی جگہ لے سکتی ہے۔ نظریہ اضافیت کو نئی مسلمہ سائنسی حقیقت ہے، نہ ہی بگ-بینگ۔ یہ محض سائنسی تھیوریز ہیں۔ بعض کے نزدیک بڑی وثاق (well-accredited) ہو سکتی ہیں۔ آج بھی ایسے سائنسدان ہیں جو ان کے مقابل دیگر سائنسی تھیوریز کو ترجیح دیتے ہیں۔ نظریہ اضافیت کے بنیادی مفروضوں میں سے ایک یہ ہے کہ کائنات میں روشنی کی سپیڈ سب سے زیادہ ہے اور مستقل ہے۔ اگر کسی وقت یہ نظریہ، یا نظریہ اضافیت کے بنیادی مفروضوں میں سے کوئی اور، غلط ثابت ہو جاتا ہے، تو کائنات کے سٹرکچر، اورینٹ اور ٹائم کی نوعیت کے بارے میں ہمارے نظریات میں بنیادی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد بگ بینگ کو ایک مسلمہ سائنٹیفک فیکٹ کے طور پر لیتے ہیں اور بعض احادیث، صوفیاء کے اقوال یا اشعار کے ذریعے متشابہ آیات مبارک میں سے بعض کی استعاراتی تاویل کر کے اسے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنا اپنا اہم مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مادے میں حیات کی نمود کو اللہ کے امر کی کرشمہ سازی قرار دیکر آپ حیات کی کیا سائنسی یا فلسفیانہ تشریح کر رہے ہیں جو دیگر تشریحات کے مقابلے میں بہتر قرار پا سکے! اللہ کا فرمان ہے کہ اس نے حیات کو خلق فرمایا، اس نے موت کو خلق فرمایا۔ (الملک:1) حیات اور موت ’خلق‘ ہیں، ’امر‘ نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے انسان میکانیکی ذرائع سے حیات پیدا کر لے، موت کو کسی درجے میں مؤخر کر لے، یا مصنوعی اعضا

تیار کر لے۔ پھر آپ اللہ کے امر کی کیا تشریح کریں گے۔ انسان کے حیوانی حیاتیاتی وجود کیلئے وہ تھیوری آف ایوولیوشن کا ماننا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ نظریہ محض تھیوری ہے جو کسی بھی وقت مسترد ہو سکتی ہے۔ خود مغرب میں آج بھی ایسے ماہرین حیاتیات ہیں جو انسانوں کے بارے میں اس تھیوری کو درست نہیں مانتے۔ کیا تھیوری آف ایوولیوشن کا درست ماننا ہمارے ایمان کا جز ہے، یا کیا اسے درست نا ماننے سے ہمارے ایمان میں کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک کی جن آیات کی استعاراتی تعبیر سے ڈاکٹر صاحب نظریہ ارتقا کو ثابت کرتے ہیں، اس سے زیادہ بہتر طور پر آدم علیہ السلام کی بحیثیت آدم تخلیق کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری ہے: ”اور بے شک ہم نے انسان کو خلق کیا ہے، اور ہمیں اس کے نفس کے وسوسوں کا علم ہے، اور ہم اسکی رگ جاں سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں۔“ (سورہ ق، 50:16) مزید ارشاد ہے: ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَن تَقْوِيمٍ“ ”کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں خلق کیا ہے القرآن، 95:4“ ”احسن تقویم پر خلق ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں کبھی کسی اضافے یا ترمیم کا مقام نہیں آئے گا۔ انسان اللہ کا محبوب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ تعلق مع اللہ کے حوالے سے انسان کے اندر جو کچھ ہونا چاہئے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا گیا ہے۔“ (تفسیر فاضلی منزل ہفتم، 449) حضرت انسان کی صورت بھی اللہ نے بنائی ہے اور اللہ نے اس صورت کو احسن بنایا ہے۔ (وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔ 64:3) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے: ”أَلَا تَرَوْنَ أَنَّكُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا“ ”کیا تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی۔ اللہ نے ہی اسے اٹھایا۔“ (القرآن، 79:27) جس نے دو دن میں ٹھیک سات آسمان بنا دیئے اس کے لئے انسانوں کو تخلیق کر دینا کتنا مشکل ہو گا کہ اس کو سمجھنے کیلئے ڈارون یا مالتھوس کے قیاسی نظریات کو بنیاد بنایا جائے۔ نطفے سے تخلیق سے پہلا درجہ تعین سے تعلق نہیں رکھتا۔ کیا عدم سے وجود کا خلق فرمانا، مالک یوم الدین کی شان نہیں! فرمان الہی ہے: وَالرُّجْزُ فَاهْجُزْ ”اور ناپاکی سے دور رہئے۔“ (القرآن، 74:5) کیا قیاسی نظریات کو حق کے مقابل وقعت دینا علماً ناپاکی نہیں! قرآن پاک میں ارشاد ہے: مَا لَكُمْ □ كَيْفَ تَحْكُمُونَ □ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسا حکم لگاتے ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں یہ پڑھتے ہو!“ (القرآن، 68:36-37) جو حوالہ قرآن پاک میں موجود نہیں وہ قابل ذکر ہی کیوں ہو۔ علم کے زعم میں مبتلاء لوگ ہی بے سند باتیں کرتے ہیں۔

کیا اللہ کے اس فرمان کے مقابل کہ ”اس نے انسان کو خلق کیا ہے۔“ یہ گمان کہ موجودہ صورت انسانی، حیاتیاتی ارتقاء کے مدارج طے کرنے کے بعد وجود میں آئی ہے، بے حقیقت بات نہیں! جو خدا اپنے بندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ طاقت عنایت کر سکتا ہے، کہ وہ مٹی سے پرندے کی مورت بنا کر پھونک ماریں اور وہ، حیوانی ارتقاء کے کسی مرحلے سے گذرے بغیر، جاندار پرندہ بن جائے، جو اپنے ایک بندے کے مردہ گدھے کی گلی ہوئی ہڈیوں کو، ان کی آنکھوں کے سامنے، ارتقائی مراحل سے گزارے بغیر استوار کر کے ان پر گوشت پوست چڑھا کر کھڑا کر سکتا ہے، تو آدم علیہ السلام کو ارتقائی مراحل سے گزار کر ہی پیدا کرنے میں اسے کیا مجبوری تھی۔ جن حیوانات کو ارتقاء کے مراحل سے گزار کر اپنے سے برتر نوع میں تبدیل کیا جاتا رہا، کیا وہ صرف مذکر ہی ہوتے تھے اور مؤنث بعد میں کسی ارتقائی تکنیک سے اس سے علیحدہ ہوتی، جوڑا بنتا اور نئی نوع (specie) وجود میں آنے لگتی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر آدم علیہ السلام کے معاملے میں ایسا کیوں ہوا! حیواناتی ارتقاء کے وہ کیا مراحل تھے جن سے گزار کر خدا نے حضرت آدم سے آپکی زوجہ محترمہ کو ان سے نکالا۔ آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو آدم علیہ السلام سے علیحدہ کرنے کے بارے میں نا ڈاکٹر اسرار احمد اللہ تعالیٰ کے کسی نئے کلمہ ”کن“ کا تذکرہ کرتے ہیں، نہ ہی عیسائیت اس کے بارے میں کچھ بتاتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ ساری کاوش حضرت علامہ صاحب کے ”سائنٹفک فارم آف ریلیجیوس نالج“ کے تصور کی تقلید کے سوا کچھ اور نہیں لگتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہی مسئلہ عیسائیت کو درپیش تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے بہت پہلے، پوپ پائس XII نے 1950 میں Humani generis کے ٹائٹل سے ایک سرکلر میں اور پھر نصف صدی بعد پوپ جان پال II نے ”Truth cannot contradict truth.“ کے عنوان سے 22 اکتوبر 1996 میں پونٹیفل اکیڈمی آف سائنس کو ایڈریس میں یہ موقف اختیار کیا کہ انسان کے حیوانی وجود کے بارے میں یہ ماننا کہ وہ ارتقائی مدارج سے ہوتے ہوئے وجود میں آیا ہے،

اور روح انسانی کو خدا نے کسی ارتقائی مدارج سے گزارے بغیر براہ راست تخلیق کیا ہے ، اور یہ کہ خدا نے اعلیٰ ترقی یافتہ نوع کے فرد کو سلیکٹ کر کے اس میں روح پھونکی، اس کا جوڑا بنایا، جس سے بنی نوع انسان وجود میں آئے ، تخلیق کے مذہبی عقیدے سے کوئی تضاد نہیں رکھتا (Gould 2001, 499-508) یہ وہی بات ہے جسے ڈاکٹر ابصار احمد انسان کی وجودی ثنویت (ontological dualism of man) کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مسئلہ تخلیق اور مسئلہ ارتقاء میں مطابقت کے حوالے سے یہی نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب اور جناب ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے اسکے انگریزی ترجمے میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔^{vii} نظریات ارتقاء کو کائنات ، حیات اور انسان کے وجود میں آنے کی تشریح کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی اپنی کتاب میں ان تینوں پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ بالعموم تین موقف اختیار کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک ارتقاء کا سائنسی نظریہ ہے جو کائنات ، حیات اور انسان کی تشریح خدا کے حوالے کے بغیر کرتا ہے۔ فی الوقت ہمیں اس سے تعرض نہیں ہے۔ (1) کائنات، حیات اور انسان کی سپیشل، اور فوری تخلیق۔ یہ عام روایتی نظریہ ہے۔ (2) الہیاتی ارتقاء (theistic evolution)۔ عیسائیت اور ڈاکٹر اسرار احمد اپنے اپنے عقائد کے مطابق یہ نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اپروچ ڈارون اور لے مارک کے نظریات کے تناظر میں ابھری ہے۔ (مولنا روم کا نظریہ جو انکے روحانی تجربات پر مبنی ہے نظریہ ارتقاء کے سائنسی تصور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔) کسی بھی درجے کی سائنسی تھیوریز کو قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ کرنے، غیر قرآنی اصطلاحات وضع کر کے یا آیات متشابہات کی آیات متشابہات کی بنیاد پر استعاراتی قیاس آرائی کے ذریعے قرآن پاک میں اپنی تجویز داخل کرنے اور اپنی خوابش read کرنے کے بارے میں ہم اپنا موقف تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے امر ’کن‘ کا مفہوم لازماً صرف ’فوری تخلیق‘ (instantaneous creation) سمجھنا درست نہیں۔ یہ ’عنوان‘ (caption) ہوتا ہے۔ امر ’کن‘ اللہ کا امر ہے۔ اس کی کسی دوسرے کلمہ (یا کلمات) کے ساتھ تطبیق خلاف حق ہے۔ اللہ اپنے امر ’کن‘ کے ذریعے جو ’عنوان‘ رکھ دیتا ہے ، اسکی حکمت کے مطابق اس کے ارکان وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں ، اور اللہ کے علم مطلق کے مطابق وہ شے وجود میں آ جاتی ہے کیا اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے ما بین ہے، کی تخلیق چھ دن میں نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ اور اس کے امر ’کن‘ کی کارفرمائیوں کو ’تنزل‘ اور ’ارتقاء‘ کی غیر قرآنی اصطلاحات کے ذریعے فہم میں لانے کی کوشش محض الجھاؤ ہی کا باعث بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اس فلسفہ آرائی کی علمی قدر و قیمت کے تعین کیلئے چند سوال قارئین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

1 کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کاوش حال پر موجود کائنات ، حیات اور انسان کے ماخذ، کی سائنسی تھیوریز پر

کوئی واقعاتی اور حقیقی اضافہ کرتی ہے! یا اس کے متوازی لیکن اس سے بدرجہا بہتر نظریہ پیش کرتی ہے!

2 کیا اس کاوش سے قرآنی تناظر میں سائنسی تحقیق کی کوئی نئی راہیں وا ہوئی ہیں یا کوئی بہتر اپروچ متعارف ہوئی ہے!

3 کیا اس کاوش میں مسلمانوں کیلئے قرآنی تعلیمات کے مطابق سائنسی ترقی کا کوئی فریم ورک دیا گیا ہے! اور مسلمانوں کی سائنسی ترقی پر اس کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

4 کیا اس کے مطالعہ سے کسی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے! کیا اس پر نجات کا انحصار ہے!

سید حسین نصر

سید حسین نصر (پ 1933) مغرب کی ملحدانہ سائنس (پروفین سائنس) کے بالمقابل ایک مقدس سائنس (سیکرڈ سائنس) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ الہامی علم کی بنیاد پر اسلامک سائنٹفک تھائٹ کی تشکیل کی کاوش میں گزرا ہے۔ وہ الہامی علم کی بنیاد پر ایسی سیکرڈ سائنس کی فلسفیانہ بنیادیں تشکیل دینا چاہتے ہیں جسکا مطمحہ نظر فطرت کی تسخیر نہیں ہو گا، بلکہ احکام الہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسے استعمال میں لانے پر مشتمل ہو گا۔ لیکن ابھی تک کوئی قابل قدر نتائج سامنے نہیں آ سکے۔ سید حسین نصر کے فکر کا نقص ان کی پیراڈائم میں پایا جاتا ہے۔ ان کی پیراڈائم کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

1- انسان ، خدا سے مماثل ہستی (theomorphic being) ہے۔

- (یہ عقیدہ قرآن پاک کے ارشاد کہ ”کوئی شے اس کے مثل نہیں۔“ کے صریحاً خلاف ہے۔)
- 2۔ سید حسین نصر اپنے مکتب فکر کو روایت پسند مکتب فکر (Traditionalist school) کا نام دیتے ہیں۔ روایت سے ان کی مراد وہ سب کچھ ہے جو مقدس (sacred) ہے۔ وہ سب کچھ جو انسان کو بذریعہ وحی (revelation) حاصل ہوا۔ علوم و فنون اور ثقافت میں وحی کے اظہار اور ڈویلپمنٹ کی تمام صورتیں اور ان کا حاصل بھی روایت میں شامل ہے اور سیکرڈ ہے۔ اس کے مقابل انسانی فلسفہ و سائنس سے وجود میں آنے والا تمام علم، تہذیب، ٹکنالوجی اور ان کا حاصل سب غیر مقدس (profane) اور غیر فطری ہے۔
- (سید حسین نصر نہ تو ’مقدس علم‘ کی بنیاد پر ’غیر مقدس علم‘ کے متوازی کوئی علم، سائنس یا ٹکنالوجی پیش کر سکے ہیں جو اس سے بہت اعلیٰ ہو اور نہ ہی ’مقدس علم‘ کے دائرے میں رہتے ہوئے ’غیر مقدس علم‘ (انسانی فکرو تجربہ کے حاصلات) سے استفادہ کے الہامی اصولوں کی تشکیل کر سکے ہیں۔)
- 3۔ نصر کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو توحید کا الگ تصور دیکر نہیں بھیجا۔ دیگر ادیان اس سے انحراف کے مرتکب ہوئے۔ اسلام توحید کے اصل تصور ہی کی تکمیل ہے۔ نصر اس تصور دین کو eternal sophia, or religio perennis یا الدین الحنیف (the primordial religion) کا نام دیتے ہیں۔ سید حسین نصر کا عقیدہ ہے کہ ہر الہامی مذہب میں ”حق“ اور ”حق کو پانے کا طریقہ“ پایا جاتا ہے۔ با الفاظ دیگر، ہر وہ مذہب جس میں ڈاکٹر ائن اور میٹھڈ پائے جاتے ہیں، یقیناً الہامی ہیں۔ مذاہب میں فرق انکے ڈاکٹر ائن کے اظہار کی زبان اور میٹھڈ کی تشکیل کے زمانے، کلچر اور روایت کا ہے۔ سید حسین نصر ہندو ازم کو ایسے مذاہب میں شامل کرتے ہیں جن میں یہ دونوں بنیادی جز پائے جاتے ہیں۔
- (فرمان الہی ہے: وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾ ”وہ تو نہیں مگر عالمین کیلئے نصیحت۔ 68:52 ہمارا نظریہ ہے کہ صرف قرآن پاک ہی ساری کائنات کیلئے نصیحت ہے۔ کوئی علم اس کے مقابل عالمین کو یکجا نہیں کر سکتا، یک سو نہیں کر سکتا، متحد نہیں کر سکتا۔ جو قول قطعاً درست ہو وہی سند کا درجہ رکھ سکتا ہے۔ اور قرآن پاک ہی کے بارے میں ارشاد ہے: ”إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ﴿۱۳﴾ ”یہ قطعاً درست قول ہے۔ 86:13“ جو لوگ قرآن پاک کو عالمین کیلئے نصیحت نہیں مانتے، مذاہب عالم کو بھلائی کے راستے کہتے ہیں، اور ان کو یکساں اہمیت دیتے ہیں، وہ بھی قرآن پاک کو جھٹلانے والے ہیں، اور ارشاد باری ہے: وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ ﴿۵۱﴾ اور یقیناً ہم جھٹلانے والوں کا علم رکھتے ہیں۔ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿۴۹﴾ اور بے شک یہ یقیناً حق ہے۔ 69:51“)
- 4۔ سید حسین نصر کا پورا نظام فکر مختلف مذاہب، زبانوں اور فلسفے سے اخذ کر کے وضع کی گئی انتہائی غیر مانوس، غیر واضح، پیچیدہ اصطلاحات سے تشکیل پذیر ہے۔ چند اصطلاحات درج ذیل ہیں:
- Tradition, sapiential dimention, symbolism, sophia perennis, philosophia perennis, traditional wisdom= al-hikma= theosophy, macrocosmos, microcosmos, prima materia. alchemy, horizontal, vertical, doctrine, method etc.
- (ہمارا نظریہ ہے کہ دین کو اصطلاحات کا نظام بنانا، غیر قرآنی تصورات داخل کرنا، دین سے غداری ہے اور اسکا منشاء حق کے اخفاء کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں کوئی اصطلاح نہیں۔ قرآن پاک کتاب ہدایت ہے۔ اپنا منشاء نہایت آسان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ قرآن پاک قول ہے، عمل کی طریقت کا معیار نبی پاک ﷺ کے بعد آپ کے تصدیق یافتہ شاہدین ہیں۔ عمل کے بعد عطا ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ عقل کا منشاء اصطلاحات سازی کے ذریعے دین کو فلسفہ بنانا نہیں، بندے کو تضاد سے پاک کرنا ہے۔ بعض سکالرز فلسفے کو آئیڈیالائز کر کے دین کو فلسفہ بنانا چاہتے ہیں۔ بھول نادانستہ تو ہوتی ہی ہے، دانستہ بھی ہو جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کی مغفرت فرمائے۔)
- 5۔ ’مطلق حقیقت‘ اور ’اضافی حقیقت‘ کے درمیان حقیقت کے درجات ہیں۔
- (یہ قرآن پاک سے بالکل متغائر بات ہے۔ یہ اصطلاحات خدا اور ماسوا ء کو درجات کے اعتبار سے مختلف لیکن نوعیت کے اعتبار سے یکساں بنا دیتی ہیں، جو قطعاً خلاف حق ہے۔ کائنات بشمول بشر اور دیگر تمام مخلوقات وغیرہ مکمل طور پر حقیقت ہیں، خلق اور امر پر مشتمل ہیں۔ اللہ حقیقت کو منصفہ شہود پر لانے والا، Originator of reality ہے۔)
- 6۔ حکمت، علم اور سائنس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کائنات میں سیکرڈ کو منکشف کر کے توحید کے الہامی تصور کی توثیق کرے۔ نیچرل سائنسز کا مقصد یہ ہے کہ وہ نیچر کو سیکرڈ کے ساتھ مربوط کریں۔ نصر کے مطابق اسلام میں علوم اور فنون کا مقصد موجودات میں وحدت اور ربط کو آشکار کرنا ہے۔ نصر کے مطابق جدید نیچرل سائنس فطرت کے صرف مقداری پہلو کے مطالعے (quantitative study) اور ٹیکنالوجی کی ڈویلپمنٹ تک محدود ہے، جبکہ نصر کا نظریہ ہے کہ اسلامی سائنس کا نصب العین ایسا علم ہو گا جو طالب علم کو روحانی تکمیل سے ہمکنار کرے۔ نصر کے مطابق تمام سائنسز یکساں اہمیت کی حامل نہیں۔ ریاضی (mathematics) کو دیگر علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ میڈیکل سائنس کو بھی فوقیت دیتے ہیں۔ علم الاعداد کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

(ان پیش فرضیوں کی بنیاد پر سید حسین نصر (پ 1933) سوائے ماحولیاتی توازن (ecology) پر کچھ بامعنی گفتگو کر سکنے کے مغربی سائنس اور فلسفیانہ علوم کے مقابل ان سے بہتر یا کم از کم ان جیسی کوئی سیکرڈ سائنس ، فلسفہ یا ٹیکنالوجی وجود میں نہیں لا سکے جو اپنے طالب علموں کو روحانی تکمیل سے بھی نوازے۔) (S. H. Nasr 1966, 97-151)

اجمالی مکتب فکر — ڈاکٹر ضیاء الدین سردار

اجمالی مکتب فکر مختلف نظریات کے حامل سکالرز کا گروپ تھا جو سائنس کی معروضیت کے منکر تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ سائنس ایک کلچرل ایکٹوٹی ہے جو سائنسدان اور اس کے نظریہ کائنات سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ضیا الدین سردار کی سربراہی میں اس گروپ نے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کی کافی کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکا اور مدت ہوئی اس کے ارکان بکھر چکے ہیں۔

انٹر نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک ٹھاٹ (آئی آئی آئی ٹی)

اس پوزیشن کی بنیاد جن مقدمات پر ہے وہ یہ ہیں کہ (۱) مسلم اُمہ بہت الجھاؤ کی حالت میں ہے۔ یہ الجھاؤ انٹلیکچوئل قسم کا ہے۔ اس کی جڑیں اسلام سے متغائر ویژن پر مبنی نظریات سے مسلم فکر پر مرتب ہونے والے اثرات میں ہیں۔ اس مکتب فکر کے مطابق بنیادی مقدمات جن پر اسلامک سائنس کو استوار کیا جا سکتا ہے، وہ مشتمل ہیں (1) ایسے نظریہ کائنات پر جو تسلیم کرتا ہو کہ قرآن پاک انسانی سر گرمی کے ہر میدان میں رہنمائی دینے کی اہلیت رکھتا ہے ؛ (2) یہ کہ خدا نے کائنات کو بے مقصد نہیں بنایا اور اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ [؟] اجل مسمیٰ تک حضور ﷺ کی ذات اقدس وہ نمونہ ہے جس کا اتباع لازم ہے۔ (3) نیچر کو بے جا ضائع نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ اسے اپنے خالق کی طرف سے ایک امانت سمجھ کر استعمال میں لانا چاہئے (Stenberg, 166)۔

(انسان 'خَلِيفَةُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ' نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اس بات سے کہ کائنات کے کسی حصے میں کوئی اس کا خلیفہ ، نائب یا قائم مقام ہو۔ انسان کو اللہ نے 'فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً' (2:30) یا 'خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ' (38:26) 'خَلِيفَةُ فِي الْأَرْضِ' (10:14) بنا کر بھیجا ہے۔ " خلافت کی حقیقت اختیار ہے جس کا منشا یہ ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لایا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر خواہش کی پیروی کو رائج نہ ہونے دیا جائے کیا یہ ممکن ہے کہ خلاف حق مفروضوں پر کسی صحیح اور مضبوط فکر کی بنیاد رکھی جا سکے!)

آئی آئی آئی ٹی بھی کوئی ایسی واضح پیراڈائم دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا جو مسلمانوں میں فطرت کے سائنسی مطالعہ (نیچرل اور سوشل دونوں) کا ایسا شعور اجاگر کر سکتا کہ وہ بہت اعلیٰ عبادت سمجھ کریکسوئی کے ساتھ اس میں مصروف ہوتے جیسے کہ سر سید اور اقبال چاہتے تھے۔ لیکن کسی کو ان حضرات کے اخلاص اور قابلیت پر شک کرنے یا ان کی کاوش کی تحقیر کرنے کا حق قطعاً نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا حق ادا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ جن چیلنجز کا مقابلہ کیا، وقتی اعتبار سے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ لیکن بہترین کی گنجائش ہر مقام پر رہتی ہے۔ ہم نے اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش میں ، سائنس، فلسفہ اور اسلام کا آپس میں تعلق واضح کرنے کیلئے قرآن پاک سے اصول وضع کئے ہیں جو قارئین کیلئے پیش خدمت ہے۔ حتمیت کا دعویٰ قطعاً نہیں۔ عبادت سمجھتے ہوئے علم کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

ہماری مجوزہ پیراڈائم

1۔ (ا) ہماری مجوزہ پیراڈائم کا بنیادی نکتہ بدعت کا اصول (principle of innovation) ہے۔ یہ وہ قرآنی اصول ہے جو اجتہاد کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔ بدعت کا اصول انسان کی فکری کاوش اور تجربہ سے حاصل ہونے والے مفید اور مسلمہ علم کو قرآن کے الہامی علم سے نسبت دینے کیلئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جس طرح ایک مدت تک مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تصور چھایا رہا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا، اور ہم صدیوں اس کی برکات سے محروم رہے، اسی طرح بعض علماء کے اخلاص نیت کے باوصف، انکی کوتاہ نظری سے، ہم ابھی تک بدعت کے قرآنی اصول کی برکات سے محروم چلے آ رہے ہیں۔

(ب) سورہ الحدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع کرنے والوں کی بات ہو رہی ہے کہ رهبانیت کی ابتدا (بدعت) انہوں نے از خود کی تھی۔ یہ اللہ نے ان پر نہیں لکھی تھی۔ ان کا منشاء اللہ کی رضا چاہنا تھا۔ پھر اس کی رعایت نہ رکھی جیسے اس کی رعایت کا حق تھا۔ فرمایا گیا: ”تو ان میں سے ایمان والوں کو اللہ نے ان کا اجر دیا، اور کثیر ان میں سے فاسق ہوئے۔“ (القرآن، 27:57) اللہ نے انہیں رهبانیت کی بدعت اختیار کرنے پر سرزنش نہیں کی۔ بدعت کے معاملے میں اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ منشاء، اللہ کی رضا کے سوا کچھ نہ ہو۔ (یعنی منکرات کے معاملے میں کوئی بدعت اختیار نہیں کی جا سکتی)، نفس کی رعایت کا حق رکھا جائے جیسے کہ اسکی رعایت کا حق ہو۔ ’الراسخون فی العلم‘ ہی کسی معاملے میں بدعت کی حدود کا تعین کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

(ج) قرآن پاک حکم ہے اور حدیث، حکم کی تنفیذ۔ حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے۔

”اور لوگوں میں حج کی اذان دیجئے، کہ وہ آپ کے پاس آئیں، پیادہ اور دبلے دبلے اونٹوں پر، دو راہوں سے چلے آئیں۔“ (سورہ الحج، 22:27) کیا آج ہم اس حکم پر اسی طرح عمل پیرا ہیں! کیا یہ ممکن ہے! یہ حدیث نہیں، قرآن پاک میں اللہ کا حکم ہے۔ کیا اللہ کے حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام اور مقدار کے مطابق ڈھل نہیں گیا! کیا یہ بدعت نہیں! عیسوی تقویم کی طرح آئندہ سالوں کیلئے قمری تقویم کو رائج کرنے اور اس کے مطابق مہینوں کے آغاز، اور مذہبی تہواروں کی تاریخوں کو رائج کرنے کے معاملے میں رویت ہلال سے متعلق احادیث پر عملدرآمد کا طریقہ وقت مقام اور مقدار کے مطابق کیوں نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے فرمایا نہیں قرآن پاک میں: ”بے شک بیت اول جو لوگوں کے لئے وضع ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے مبارک اور عالمین کیلئے ہدایت۔“ (القرآن، 3:96) اس آیت پاک میں مکہ کو ’بکہ‘ کہا گیا ہے جسکا مطلب ہے ’مرکز‘۔ کیوں حرم کعبہ تمام عالم اسلام کا مرکز نہیں ہو سکتا رویت ہلال سمیت تمام قابل عمل معاملات میں! اللہ کے اس حکم کے ہوتے ہوئے کیا چیز مانع ہے سوائے اس کے کہ حدیث پاک جو تنفیذ ہے حکم کی، اسے حکم پر فوقیت دے دی گئی ہے! حدیث پاک کو ’احسن الحدیث‘ پر ترجیح دے دی گئی ہے!

رمی جمار حج کا ایک رکن ہے۔ صدیوں سے حجاج کرام 10 ذوالحجہ کو صبح اشراق سے دوپہر تک، اور 11 اور 12 ذوالحجہ کو دوپہر سے غروب آفتاب تک، اس رکن کی ادائیگی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ اس حوالے سے قرآن پاک میں کوئی حکم نہیں، تاہم سنت پاک اور حدیث پاک کے حوالے سے یہ حج کا ایک لازمی رکن تصور کیا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ حج کے باقی ارکان بذات خود ادا کرنے ہوتے ہیں، جبکہ یہ رکن کسی دوسرے سے بھی ادا کروایا جا سکتا ہے۔ حرم شریف کی انتظامیہ کی تمام کوششوں کے باوجود پچھلی چند دہائیوں میں کئی بار بہت بڑی تعداد میں حجاج کرام اس رکن کی ادائیگی کے دوران حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ حجاج کرام کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ عملاً مذکورہ وقت کے اندر اس رکن کی ادائیگی ممکن ہی نہیں رہی۔ چنانچہ علماء کرام نے اس رکن کی ادا نیگی کا ٹائم تینوں ایام میں پورے دن رات تک بڑھا دیا ہے۔ اگر اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ حکم پر عمل درآمد کا طریقہ وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ’بدعت‘ کے اصول کی صورت میں اسکی گنجائش رکھی ہے تو ہم بہت پہلے اجتہاد کر کے بڑے بڑے نقصانات سے بچ سکتے ہیں اور بہت بڑی برکات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

سورہ البقرہ میں ارشاد ہے: آپ حج کی نیت سے نکلتے ہیں۔ روکے جانے کی کوئی صورت باذن اللہ بن جاتی ہے اور اسے عبور کرنے کی وسعت نہیں۔ اگر قربانی بھیجی جا سکتی ہو تو بھیج دی جائے، اس کے اپنے محل تک پہنچ جانے کا اندازہ رکھا جائے، اس کے بعد اپنا سر منڈایا جائے۔ اگر نہ بھیجی جا سکتی ہو، تو وہیں قربانی کر دی جائے۔ (القرآن، 2:196) کیا اس آیت مبارک سے یہ دائمی اصول اخذ نہیں ہوتا کہ حکم پر عملدرآمد وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتا ہے (State and Statecraft،

2- اس کا دوسرا نکتہ ایک میکانیکی یا اضافیتی تصور کائنات کے مقابل الہی ایڈمنسٹرڈ کائنات (divinely administered universe) کا تصور ہے۔ کائنات قوانین فطرت کے مطابق ہی چل رہی ہے لیکن ایک الہی ایڈمنسٹرڈ کائنات میں قوانین فطرت اللہ کے مقرر کردہ اور اسکی قدرت کے تابع متصور ہوتے ہیں نہ کہ اس کے برعکس۔

3- (ا) یہ پیراڈائم ”مسلمہ سائنسی حقائق“ اور ”سائنسی تھیوری“ میں فرق کرتی ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھی جانی چاہئے کہ تھیوریز آف سائنس (نیچرل، ریشنل، باؤلوجیکل، سوشل، میتھے میٹیکل وغیرہ) اور انٹلیکچوئل ویو آف رئیلٹی (فلسفہ) آپس میں بہت قریبی طور پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور دونوں ایک ہی کیٹیگری سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی درجے کی واثق سائنسی تھیوریز (well-accredited theories) کو قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، غیر قرآنی اصطلاحات وضع کر کے قرآن میں اپنی تجویز داخل کرنا، آیات متشابہات کی بنیاد پر تفسیر یا استعاراتی (میٹا فاریکل) قیاس آرائی کے ذریعے قرآن پاک کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا خلاف حق ہے۔

(ب) کائنات کی نیچر اور سٹرکچر کی کسی تھیوری کو تھیوری سمجھتے ہوئے کوئی رائے رکھنا، مطالعہ و تحقیق کرنا، تعلیم دینا، اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی تھیوری کی مطابقت میں ٹیکنالوجی ڈویلپ کرنا یا ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنا قطعاً خلاف حق نہیں ہے۔ یہی بات نظریہ ارتقا کے بارے میں بھی درست ہے۔

(ج) ایک سائنٹفک تھیوری کائنات کے کس خاص پہلو کے بارے میں ایک سائنسی قیاس آرائی (conjecture) ہوتی ہے۔ مثلاً نظریہ علییت، تھیوری آف انٹیم مکنکس، کائنات کے وجود میں آنے کے بارے میں نظریات (بگ بینگ تھیوری وغیرہ)، آغاز حیات اور حیاتیاتی انواع کے وجود و ارتقاء کی تھیوریز۔ اسی طرح سماج کے آغاز، ارتقاء اور سماجی تبدیلیوں اور تاریخی انقلابات کے متعلق سائنسی تھیوریز، پولیٹیکل ایڈمنسٹریشن اور گورننس کے متعلق نظریات۔ اکنامک، سوشل اور پولیٹیکل، یجوکیشن اور ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن کے مسائل پر مختلف تھیوریز۔ حقوق انسانی کے بارے میں نظریات۔ جسمانی بیماریوں، انسانی مزاج اور ان کے علاج کی مختلف تھیوریز، نفسیات، نفسیاتی بیماریوں اور ان کے علاج کے متعلق نظریات۔ غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں نظریات۔ بعض تھیوریز کے بارے میں مضبوط شواہد سے لیس ہونے (well-accredited) کا دعویٰ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ذہنوں میں بٹھادی جانی چاہئے کہ یہ سائنٹفک تھیوریز ہیں، کائنات اور زندگی کے بارے میں سائنسی قیاس آرائی (conjecture) ہیں، مسلمہ سائنسی حقائق (established scientific fact) نہیں ہیں۔ مسلمہ سائنسی حقیقت نہ ہونے کے باوجود، یہ ہمیں کائنات کے مختلف مظاہر کے بارے میں پیشین گوئی کے قابل بناتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر ایجاد کی جانے والی ٹیکنالوجی متوقع نتائج پر بہتر کنٹرول مہیا کر کے ہماری زندگیوں کو آسان بنا تی ہیں۔ یہ علم انسانی یا علم کسب (man-made knowledge) ہے۔ یہ انسانی تجربے، تحقیق، اور غور و فکر کا حاصل ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں ہم پہلے سے ہی اس سے استفادہ نہ کر رہے ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علم میں راسخ حضرات معاملہ زیر بحث میں قرآنی حدود واضح کریں، علم اور شعور کے ساتھ علم الہی کے ساتھ ریلیٹ کریں، اور مسلمان اس کو بدعت کے قرآنی اصول کی روشنی میں قبول کریں۔ ایک مسلمان عبادت سمجھ کر کسی بھی میدان میں اعلیٰ درجے کی سائنسی تحقیق میں مصروف ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق کائنات صرف تجربی اور حسیاتی پہلو (empirical) ہی پر مشتمل نہیں، حقیقت کے اور بھی پہلو ہیں جو اپنے اپنے قوانین کے مطابق چلتے ہیں۔

4- اس پیراڈائم کا چوتھا نکتہ قرآنی وجودیات (ontology) کی تشکیل ہے۔ قرآنی وجودیات کے مطابق ’خدا‘ سمیت تمام کائنات تین عنوانات کے ذیل میں آتی ہے :

(ا) خدا ؛ جو احد ہے۔ (مثال سے پاک) ۔

بے نیاز ہے ۔ (احتیاج، نقص، خواہش سے پاک ہے۔ اس نے سب کچھ اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں بنایا۔)

اس نے کسی کو جنا نہ اسے کسی نے جنا ۔
کوئی اسکا ہمسر ہے نہ شریک۔

(ب) خلق

(ج) امر

(ماسوا اللہجو کچھ ہے وہ خلق کی کیٹیگری سے تعلق رکھتا یا امر کی کیٹیگری سے۔ لیکن کسی بھی طرح اlobیت میں شریک نہیں۔)

5۔

آیاتِ قرآن پاک کی تعبیر کیلئے لازم ہے کہ

(ا) قرآن پاک کے تضاد سے پاک ہونے پر ایمان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ کلام کو ’احسن‘ فرمایا ہے۔ (القرآن: 39:55) اس میں اگر تضاد نظر آئے، تو وہ خود بندے کے اپنے اندر ہی سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے نکلنے کا طریقہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ ”اہل ذکر سے سوال کرو اگر تمہیں معلوم نہ ہو،“۔ یہ بھی فرمایا ہے: ”ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔“ چنانچہ اگر تضاد دور ہوتا معلوم نہ ہو تو اہل ذکر میں سے کسی کو، کسی اپنے سے بہتر جاننے والے کو، تلاش کرنے کا حکم ہے۔

(ب) قرآن پاک ’الحق‘ (the standard of truth) ہے۔ سند (authority) کا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (القرآن، 2:42، 6:73) کسی بھی نظریہ، اصول، عقیدہ، روایت، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، قیاس، تصور، تخیل، تاثر، وجدان، واردات، حال، کشف، شہود، تشریح، تعبیر کی صداقت کا حتمی معیار قرآن پاک ہی ہے۔ قرآن پاک جس کی تصدیق کرتا ہے وہ حق ہے، جس کو رد کرتا ہے وہ خلافِ حق (بغیر الحق) ہے۔ (2:61، 3:21) قرآن پاک کے حوالے کے بغیر کی گئی بات محض رائے، قیاس، گمان یا ظن کا درجہ رکھتی ہے، ’اور ظن کسی کو حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔‘ جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو، وہ لاحقہ حاصل ہوتی ہے، لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے، اور مومن لغو سے اعراض کرتے ہیں۔ (القرآن، 10:36، 53:28) ذات باری کے بارے میں وہی تصور، خیال، احساس، تشبیہ، تعبیر، روحانی تجربہ، روایت، ظن، قیاس، نظریہ، فلسفہ درست ہو گا جو قرآن پاک کی سند کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔

(پ) اللہ نے احسن الحديث کتاب نازل فرمائی، ایک جیسی دوبرے بیان والی۔۔۔ اللہ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي تَفْشَعُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكَ هُدَىٰ اللَّهِ يَهْدِي بِهِ ۖ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿١﴾ (الزمر 39:23) احسن الحديث کتاب سے بہتر بات کا تصور بھی درست نہیں۔ احسن بات وہی ہو گی جس کی قرآن پاک سے تصدیق ہو۔ ضروری ہے کہ کسی بات کے درست یا غیر درست ہونے کیلئے قرآن پاک سے کم از کم دو حوالے ضرور پیش کئے جائیں۔ محض ایک حوالے سے الجھاؤ دور نہ ہو گا۔

(ج) بندے کی نیت کا علم اللہ سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ کس سے در گزر کرنا ہے یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے، اور اللہ بہت در گزر فرمانے والا مہربان ہے۔ علم کی حد تک کسی بھی نظریے یا اسکی تشریح کے درست ہونے کیلئے اسکا قرآن پاک کی محکمت سے مطابقت رکھنا لازم ہے۔

(د) قرآن پاک، حدیث پر حکم ہے، نہ کہ اس کے بر عکس۔ حدیث پاک کی تعبیر کے درست ہونے کیلئے لازم ہے کہ وہ قرآن پاک سے متناقض یا متصادم نہ ہو۔ قرآن پاک حکم ہے، حدیث حکم کی تنفیذ ہے۔ حکم دائمی ہے۔ تنفیذ حکم، وقت، مقام، اور مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ حدیث پاک، قیامت تک کیلئے تنفیذ حکم کی نظیر (precedent) ہے جسے ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔

6۔

انسان ’خليفة الله في الارض‘ نہیں ہے، ’في الارض خليفة‘ ہے۔ ”انسان کو اللہ نے زمین میں خلیفہ بنا کر بھیجا ہے یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔“ (ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ -) سورہ یونس، 10:14۔ مزید حوالوں کیلئے دیکھئے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ - ”اور جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ 2/30:23 وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا

آتَاكُمْ۔۔ اور اسی نے تمہیں زمین میں خلافت دی، اور بعض کو بعض پر رفعت درجات دی ہے، کہ تمہیں اپنی عطا کے حوالے سے دیکھے۔۔“ (6:166) /يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ -“ (اے داؤد (علیہ السلام) بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ ٹھہرایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کیجئے اور خواہش کی پیروی نہ کیجئے کہ وہ آپ کو اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔۔“ (38:26) خلافت کی حقیقت اختیار ہے جس کا منشا یہ ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لایا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر خواہش کی پیروی کو پروموٹ نہ ہونے دیا جائے۔ تحقیق کی صلاحیت بھی اللہ کی عطا ہے۔ تحقیق کا منشا قول کو قرآن پاک کی سند سے روشن کرنا ہونا چاہئے۔ حق کو روشن کرنا اور اسکی روشنی کو پھیلانا اللہ کو پسند ہے۔ حق کو پانے کیلئے علم والوں سے سوال کیا جائے تو اس سے بھی یہ روشنی پھیلتی ہے۔ (تفسیر آیات سورہ الطور 3-52) (تفسیر فاضلی منزل ہفتم، 46) حق کے روشن ہونے سے معاشرتی اکائی خوف سے پاک ہوتی ہے۔ معاشرے کا آغاز میاں۔ بیوی پر مشتمل خاندانی اکائی سے ہوتا ہے۔ باقی سب رشتے اسی رشتے سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ رشتہ قول پر استوار ہوتا ہے۔ قول، حق کی سند سے روشن ہو گا تو معاشرتی اکائی خوف و حزن سے پاک ہو گی۔ تمام تحقیق کا حتمی منشا اور حاصل معاشرتی اکائی کے قول، عمل، علم اور اخلاص کی حفاظت ہوتا ہے۔

ⁱSource:Cartage.org: <http://www.cartage.org.lb/en/themes/sciences/mainpage.htm>

ⁱⁱ Cf. The Physics of the Universe: Cosmological theories through history, <http://physicsoftheuniverse.com/cosmological.html>

ⁱⁱⁱ Cf. (http://www.skwork.com/p-c_s-4_u-138_t-400_c-1407/einstein-s-theory-of-relativity-nsw/einstein-s-theory-of-relativity-the-big-bang-and-our-universe/the-origin-of-the-universe)

^{iv} یہ روایت معمولی اختلاف کے ساتھ درج ذیل پانچ مختلف صورتوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۱۔ ”میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بُرا آدمی کہتا ہے زمانے کو، حالانکہ زمانہ میرے ہاتھ میں ہے، رات اور دن میرے اختیار میں ہیں۔“

۲۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آدمی مجھے ایذا دیتا ہے بُرا کہتا ہے زمانے کو اور میں خود زمانہ ہوں، لہذا رات اور دن کو۔“

۳۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ جلّ جلالہ نے ارشاد فرمایا: تکلیف دیتا ہے مجھ کو آدمی، کہتا ہے ہائے کم بختی زمانے کی! تو کوئی تم میں سے یوں نہ کہے ہائے کم بختی زمانے کی! اس لئے کہ زمانہ میں ہوں، رات اور دن میں لاتا ہوں، جب میں چاہوں گا تو رات اور دن موقوف کر دوں گا۔“

۴۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی تم میں سے یوں نہ کہے، اے کم بختی زمانے کی! اس واسطے کہ زمانہ تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

۵۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ ط مت بُرا کہے کوئی تم میں سے الدھر (یعنی زمانے) کو اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ خود الدھر ہے۔“

^v قرآنی وجودیات افلاطون اور ارسطو کی وجودیات سے مختلف ہے، جس کے مطابق کوئی چیز ’قدیم (eternal)‘ ہے یا ’حادث (accidental)‘، کوئی چیز ’مخلوق‘ ہے یا ’غیر مخلوق‘۔ یونانی وجودیات ثنویتی (dualistic) ہے۔ افلاطون کی وجودیات میں ایک تو افلاکی حقائق کا عالم ہے (celestial world) اور دوسرے کون و مکان کی دنیا (spatio-temporal world)۔ عالم افلاک میں خدا ہے، عالم امثال ہے، روح کائنات ہے، اور بھی کئی چیزیں ہیں۔ یہ سب ازلی ہیں۔ عالم کون و مکان میں سب کچھ حادث ہے۔ جبکہ ارسطو کی وجودیات مشتمل ہے (۱) ’خالص صورت (Pure Form)‘ پر جسے وہ خدابیہ کہتا ہے، اور (۲) ’خالص مادہ (Pure Matter)‘ پر۔ یہ دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے کے متوازی حقائق ہیں۔ یہ رنیل ہیں لیکن زمانی و مکانی وجود نہیں رکھتے ہر حادث شے، زمانی و مکانی ہے، وجود رکھتی ہے اور ان دونوں کے امتزاج پر مشتمل ہے۔

^{vi} اس آرٹیکل کی اشاعت کے چند ہفتے بعد تنظیم اسلامی کی دعوت پر جناب اسحاق ظفر انصاری نے باغ جناح لائبریری میں اس موضوع پر خطاب فرمایا کہ مسلمان سائنسی ترقی میں کیوں پیچھے ہیں۔ انہوں نے بالکل ڈاکٹر اسرار احمد ہی کے نظریات کی تائید کی۔ راقم بھی اس موقع پر موجود تھا۔

^{vii} رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins, 1941-) اپنے آرٹیکل ”Science Discredits Religion“ میں نظریہ ارتقاء پر عیسائیت کے عقائد تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان سے قریب ترین مماثلت رکھنے والے جانوروں میں سے خدا

نے کسی فرد کو سلیکٹ کر کے اس میں انسانی روح انجیکٹ کر دی، تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، یہ کب پیش آیا! ملین سال پہلے؟ دو ملین سال پہلے؟ یہ ابتدائی حیوان کون تھے؟ [یہ بات ڈاکٹر اسرار احمد پر بھی پوری اترتی ہے۔]